داعی کے
اوصاف
بنت الاسلام

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ
بَلِّغُوۡا عَنِّیۡ وَلَوۡ آیَۃً۔ (بخاری)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے
پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی ہو۔

دعوتِ دین کی تاکید اور فضیلت

حضرت نعمانؓ بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی حدود پر قائم رہنے والے اور ان کو توڑ دینے والے کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جنہوں نے قرعہ اندازی کر کے ایک کشتی کے حصے آپس میں بانٹ لیے۔ ان میں سے بعض کو اُوپر کا حصہ ملا اور دوسروں کو نیچے کا۔ جو لوگ کشتی کے نیچے کے حصے میں تھے انہیں جب پانی لینا ہوتا تو وہ اُوپر والوں کے پاس سے گزرتے (انہوں نے سوچا کہ ہمارے بار بار اُوپر جانے سے اُوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے) پس وہ کہنے لگے کہ اگر ہم اپنے حصے میں شگاف کر لیں (اور شگاف کے ذریعے پانی لے لیا کریں اور بار بار اوپر جا کر) اوپر والوں کو تکلیف نہ دیں (تو اچھا ہے)۔ اب اگر اوپر والے انہیں (ایسا کرنے سے نہ روکیں گے اور انہیں) چھوڑ دیں گے کہ اپنا (یہ خطرناک) ارادہ پورا کر لیں، تو (شگاف کے ذریعے کشتی میں پانی بھر آئے گا اور اسے ڈبو دے گا اور) پھر سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن اگر اُوپر والے ان کا ہاتھ پکڑ لیں گے (اور انہیں شگاف کرنے سے روک دیں گے) تو (خود بھی) بچ جائیں گے اور (باقی) سب بھی نجات پائیں گے۔ (بخاری)

اس حدیث سے دعوتِ دین کی اہمیت اور ضرورت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ کفر، شرک اور بداعمالیوں کو اپنانے والے درحقیقت اس دنیا کی بربادی کا بندوبست کر رہے ہوتے ہیں جیسے کہ کشتی کے نیچے کے حصے میں رہنے والے پیندے میں سوراخ کر کے کشتی کو ڈبونے کا بندوبست کر رہے تھے۔ اب اگر حق پرست لوگ برائیوں میں مبتلا انسانوں کو بُرائیوں سے روکنے اور راہِ راست کی طرف لانے کی کوشش نہیں کریں گے تو پھر ان کی بدعملیوں کے باعث جب دنیا میں مختلف اقسام کے فساد پھیلیں گے اور علاقے تباہ ہوں گے تو اس سے صرف وہی لوگ مبتلائے مصیبت نہیں ہوں گے

جنہوں نے برائیاں کی تھیں بلکہ وہ نیکوکار بھی تباہ ہوں گے جنہوں نے اگرچہ برائیوں کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ انہیں پھلتے پھولتے دیکھتے رہے اور انہیں روکنے کی کوشش نہ کی۔ چنانچہ ان حق پسندوں کے اپنے بچنے کی صورت بھی یہی ہے کہ وہ بُروں کو بُرائیوں سے روکنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس طرح وہ صرف اُن بُروں ہی کو بربادی سے نہیں بچائیں گے بلکہ اپنے آپ کو بھی تباہی سے محفوظ کرنے کا بندوبست کرلیں گے۔

سنن ابی داؤد، باب الامر والنہی میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے، جس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے:

...... رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ خدا (ظالموں پر نازل کیے جانے والے) عذاب کو عام کرکے ان (ظلم سے نہ روکنے والوں) کو بھی اس کی لپیٹ میں لے لے ....

(ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کے سلسلے میں متعدد آیات نازل فرمائی ہیں۔ سورہ مائدہ آیت ٦٧ میں فرمایا گیا ہے:

"(اے پیغمبر) جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا......"

سورۃ الانعام آیت ٥١ میں ارشاد ہوا ہے:

"اور (اے نبیؐ) تم اس (علم وحی) کے ذریعے سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا اقتدار والا) نہ ہو گا جو ان کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے۔ شاید کہ (اس نصیحت سے متنبہ ہو کر) وہ خدا ترسی کا رویہ اختیار کرلیں۔"

سورۃ الاعراف کے شروع میں ارشاد ہوا ہے:

"ا، ل، م، ص۔ یہ ایک کتاب ہے، جو (اے نبیؐ) تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔

پس تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے (منکرینِ حق کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاد دہانی ہو۔"

جھجک سے یہاں مراد یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی اس کتاب کو بغیر کسی جھجک اور خوف کے لوگوں تک پہنچا دو اور اس بات کی پروا نہ کرو کہ مخالفین اس کا کس طرح استقبال کریں گے۔

سورۃ الانعام آیت ۷۰ میں فرمایا گیا ہے:

"(اے نبیؐ) چھوڑو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے، جنہیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں مگر یہ قرآن سُنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے ہوئے کرتُوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے اور گرفتار بھی اس حال میں ہو کہ اس کے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی نہ ہو، اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیے میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے، کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے۔"

سورۃ النحل آیت ۱۲۵ میں حکم دیا گیا ہے:

"(اے نبیؐ) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریق پر جو بہترین ہو۔"

سورۃ الاعلیٰ آیات ۸ تا ۱۳ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

"اور (اے نبیؐ) ہم تمہیں آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں۔ لہٰذا تم نصیحت کرو، اگر نصیحت نافع ہو۔ جو شخص (اللہ تعالیٰ سے) ڈرتا ہے وہ (تو) نصیحت قبول کرے گا اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا۔ پھر نہ اس میں مرے گا نہ جئے گا۔"

یہ تو وہ احکام تھے جو دعوتِ دین کے سلسلے میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

کر دیے گئے۔ اب ایک نگاہ اُن احکام پر بھی ڈال لی جائے جو آپؐ پر ایمان لانے والی اُمّتِ مسلمہ کو مخاطب کر کے دیے گئے ہیں :

سورہ آل عمران آیت ۱۰۴ میں ارشاد ہُوا ہے :

" (اے مسلمانو!) تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور رہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بُلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور بُرائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے "

اسی سورت میں آگے آیت ۱۱۰ میں فرمایا گیا ہے :

" (اے مسلمانو!) تم وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں (کی ہدایت اور اصلاح) کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ "

سورۃ التوبہ آیت ۷۱ میں ارشاد ہُوا ہے :

" اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے "

اسی سورت میں آیت ۱۱۲ میں فرمایا گیا ہے :

" (مومنوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ) توبہ کرنے والے، اللہ کی بندگی بجا لانے والے، اُس کی تعریف کے گُن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور خدا کی (قائم کردہ) حدوں کی حفاظت کرنے والے (ہوتے ہیں، پس اے نبیؐ (ایسے) مومنوں کو خوشخبری دے دیجیے "

سورۃ الانعام آیت ۶۹ میں ارشاد ہُوا ہے :

" ان پرہیزگار لوگوں پر اُن (لوگوں) کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمّہ داری

نہیں ہے (جو اللہ تعالیٰ کی آیات پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں) البتہ ان (پرہیزگاروں) پر یہ فرض ہے کہ (اُن نکتہ چینیاں کرنے والوں کو) نصیحت کریں۔ شاید کہ وہ لوگ غلط روی سے بچ جائیں۔"

سورۃ الحج آیات ۷۷، ۷۸ میں ارشاد ہوا ہے:

"اے ایمان والو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو اور اللہ کی راہ میں خوب کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چُن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ (تم قائم ہو جاؤ) اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآنِ پاک) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے) تاکہ رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔"

یہاں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "رسولؐ تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو" اس کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوع انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا۔ اس وقت رسولؐ ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکر صحیح اور عمل صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اُسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسولؐ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا، تم نے انہیں پہنچا دیا ہے، اور جو کچھ رسولؐ نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔" (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۱۹)

آیاتِ الٰہی کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کے متعلق کیا فرمایا ہے۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم ضرور نیکی کی طرف دعوت دیتے رہنا اور ضرور برائی سے روکتے رہنا، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر تم اس سے دعائیں کرو لیکن وہ قبول نہ ہوں۔ (ترمذی)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اُس کی اصلاح کر دے۔ پس اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان ہی سے (اس کی اصلاح کی کوشش کرے) اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو پھر دل ہی سے (اُسے بُرا سمجھے) اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ (مسلم)

حجۃ الوداع کے موقع پر جب حضورؐ نے اپنا شہرۂ آفاق خطبہ ارشاد فرمایا تو مسلمانوں کو یہ نصیحت بھی فرمائی:

لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى اَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ اَوْعٰى لَهٗ مِنْهُ۔

چاہیے کہ جو حاضر ہے وہ (میرے ان احکام کو) اُسے پہنچا دے جو حاضر نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ حاضر انہیں ایسے شخص تک پہنچا دے جو انہیں پہنچانے والے سے زیادہ یاد رکھے۔ (بخاری)

سورہ مائدہ آیت ۱۰۵ میں بیان ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔

(اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو سنبھالو، اگر تم ٹھیک راہ پر ہو تو وہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے جو گمراہ ہیں)

بعض لوگوں نے غلطی سے اس آیت کا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ ہمیں خود ٹھیک راہ

پر چلنا چاہیے۔ باقی رہا دوسروں کا غلط راہ پر چلنا، تو وہ چلتے رہیں، اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے لوگوں کو ٹوکتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو، تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو، یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔۔۔۔ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ۔ (حالانکہ ہیں نے رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں لیکن اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ اُن پر کوئی ایسا عذاب بھیج دے جس کی لپیٹ میں سبھی آجائیں۔ (ترمذی)

ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"تمہارا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جس کو دوسرے لوگوں کی رہبری کے لیے بنایا گیا ہے۔"

حضرت علیؓ کے پوتے امام زین العابدین علیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ہمیشہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے اور اس سے غفلت کو کتاب اللہ سے غفلت شمار کرتے تھے۔

سورۃ البقرہ آیت ۲۰۸ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ص

(اے ایمان والو، اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت حذیفہؓ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ اسلام کے آٹھ شعبے ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، عمرہ، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ اے لوگو، ان آٹھ شعبوں میں سے اگر تم نے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو محروم رہو گے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں،

"(اے شخص)، اگر تجھے برائی ناپسند ہے تو خود (بھی) نہ کر اور پڑوسی سے (بھی) کہہ کہ (اسے) نہ کرے۔"

حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ دینِ اسلام کے لیے سرچشمۂ قوت کی حثیت رکھتی ہے، جس سے وہ طاقت حاصل کرتا ہے۔ جب ہم صحابۂ کرام رضہ کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی پاک زندگیوں میں دو ہی چیزیں نمایاں ترین تھیں، ایک صلاح اور دوسری اصلاح یعنی خود اپنی زندگیوں میں اسلام کے احکام نافذ کرنا اور دوسروں کو اسلام کی طرف بلانا۔

ابتدائی صدیوں کے مسلمانوں نے تمدن کے ہر پہلو میں نمایاں ترقی کی۔ انہوں نے سیاست، تجارت، زراعت، علوم و فنون، سیاحت غرضیکہ ہر میدان میں کام کیا مگر ساتھ ساتھ اپنے دین کی تبلیغ کو بھی جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو جو علاقے ان کے قبضے میں آئے۔ وہاں اُن کا صرف سیاسی اثر ہی قائم نہ ہوا بلکہ انہوں نے وہاں کے باشندوں کے مذاہب، زبانوں اور تہذیبوں کو بھی جیت لیا، کیونکہ انہوں نے اپنے مومنانہ کردار کے باعث ان کے دلوں کو جیت لیا تھا۔

کوئی شے فی نفسہٖ کتنی ہی اچھی اور مفید کیوں نہ ہو، اسے دنیا میں پھیلانے کے لیے ہمیشہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ دنیا والوں سے اس کا تعارف کرایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں اور فائدے ہیں۔ یہ تجارت کا ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ سامانِ تجارت کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، اُس کی گرم بازاری کے لیے ہوشیار، فرض شناس ایجنٹس کی ضرورت رہتی ہے اور ایسے ہی اُن خریداروں کی بھی جو گواہی دیں کہ انہوں نے اسے برت کر مفید پایا ہے۔ بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ اچھی اشیاء ایجنٹس کے سُست اور فرض ناشناس ہونے کے باعث سرد بازاری کا شکار ہو جاتی ہیں اور نسبتاً گھٹیا درجے کی چیزوں کی صرف اس لیے مانگ بڑھ جاتی ہے کہ ان کے ایجنٹ ہوشیار، چست و چالاک اور فعّال ہوتے ہیں۔

دینِ اسلام بھی اگرچہ وہ بہترین نظام ہے جو انسانیت کو دیا گیا ہے مگر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ دنیا کی غالب اکثریت اس بہترین نظام

سے غافل دوسری دوسری طرز ہائے زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ جس امتِ مسلمہ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اہلِ دنیا کو اس سے واقف کرائے اور اس کے احکام کو برت کر انہیں عملاً اس کی خوبیوں کا مظاہرہ کروائے، وہ مدتیں ہوئیں سخت قسم کی فرض ناشناسی کا شکار ہو چکی ہے۔ حالانکہ حضورؐ کے اقوال کے مطابق دین کی دعوت دیتے رہنا انتہائی نفع بخش سودا ہے۔

حضرت سہلؓ بن سعد سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ خدا کی قسم، اگر اللہ تیرے ذریعے ایک آدمی کو بھی ہدایت فرما دے تو یہ تیرے لیے سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ (بخاری، مسلم)

سرخ اونٹ عربوں کے ہاں بہترین مال سمجھے جاتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ہدایت کی طرف بلایا، اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے اس ہدایت کی پیروی کی، بغیر اس کے کہ پیروی کرنے والوں کے اجروں میں سے کچھ کم کیا جائے اور جس نے گمراہی کی طرف دعوت دی، اس کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جتنا ان لوگوں پر جنہوں نے اس گمراہی کی پیروی کی بغیر اس کے کہ گمراہی کی پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں سے کچھ کم کیا جائے۔ (مسلم)

حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ ایک صدقۂ جاریہ ہے جس کا اجر انسان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ جس شخص نے کسی کے سمجھانے بجھانے کے باعث ہدایت کی راہ پائی، وہ زندگی میں اس ہدایت کی بنا پر جو جو نیکیاں کرے گا اور آگے جس جس کو ہدایت کی راہ پر لگائے گا اور وہ ہدایت کی راہ پر لگنے والے جو جو نیکیاں اس ہدایت کی بنا پر کریں گے اور پھر یہ سلسلہ جتنا بھی لمبا چلتا چلا جائے گا، سب میں سے اُس انسان کو اپنا اجر برابر ملتا رہے گا جس نے پہلے شخص کو راہ دکھائی تھی۔

موجودہ زمانے میں یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فوجیں اور اسلحہ کسی قوم کو مفتوح اور مغلوب کرنے میں وہ حصہ ادا نہیں کر سکتے جو افکار اور نظریات کرتے ہیں۔ لوگ غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی کشورکشائیاں صرف اُن کی جنگی قابلیت اور بہادری کی ممنونِ احسان تھیں۔ حالانکہ ان کی فاتحانہ قوت کا اصل ضامن اُن کا مومنانہ کردار اور ان کا مخلصانہ جذبۂ تبلیغ تھا۔ ورنہ اسلام ان علاقوں میں کیوں پھیل گیا جہاں مسلمانوں کی تلوار نہیں پہنچی تھی۔

پھر بعد کے زمانے میں جب یہ تبلیغ کا جذبہ سرد پڑ گیا اور مسلمانوں کا اخلاقی اور دینی اثر ختم ہو گیا تو پھر انہوں نے سیاسی میدان میں بھی مار کھانا شروع کر دیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، یہ دوسروں پر اثر ڈالنے والے خود دوسری اقوام کے اثرات قبول کرنے لگے اور ان کا حال بنو اسرائیل کا سا ہو گیا۔ سُننِ ابی داؤد باب الامر والنہی میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ بنو اسرائیل پہلے ایک دوسرے کو بُری باتوں پر ٹوکا کرتے تھے، پھر بعد میں انہوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا اور بُروں کے ساتھ کھاتے پیتے اور اُٹھتے بیٹھتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھوں اور بُروں، سب کے دل ایک جیسے ہو گئے اور حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے اُن پر لعنت کی گئی۔

مسلمانوں نے بھی جب باہر کی گمراہ قوموں اور اپنے اندر کے گمراہ افراد کی گمراہی دُور کرنے کی سعی ترک کر دی اور ان کے ہاں معزز بننے کی کوشش شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے گمراہوں کے دلوں کی سیاہی سیدھی راہ پر چلنے والوں کے دلوں پر بھی تھوپ دی اور اب صدیوں سے اُن پر مصائب و آلام کے دروازے کھُلے ہوئے ہیں۔

زندگی کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے تمام مقاصد ایک اعلیٰ

مقصد کے تحت آجائیں اور تمام تر توجہ اس اعلیٰ مقصد کی جانب رہے۔ اسی کو نصب العین بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس ایک بڑا ہی اعلیٰ اور ارفع نصب العین تھا کہ خدا کی مخلوق کو بے غرضانہ اور مخلصانہ خدا کی طرف بلانے کی سعی کرتے رہیں۔ اپنے اس نصب العین کو نظر انداز کرکے انہوں نے خدا کی مخلوق کو بھی فلاح و سعادت سے محروم رکھا اور خود بھی خوار ہوئے۔ اس حقیقت کو عاشقِ رسولؐ علامہ اقبالؒ نے انتہائی دردانگیز پیرائے میں بیان کیا ہے۔

شبے پیشِ خدا بگریستم زار — مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

(رات میں خدا تعالیٰ کے آگے بڑی عاجزی سے رویا کہ خدایا مسلمان دنیا میں کیوں عاجز و درماندہ اور ذلیل و خوار ہیں۔ اس پر آواز آئی کہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے مگر اس دل کے اندر کوئی محبوب نہیں رکھتی)

یہ "محبوب" وہی مسلمان قوم کا نصب العین تھا جسے چھوڑ کر اب مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ

زارند و خوارند !!!

ایک دردمند دل نے مسلمانوں کی مثال ایک ایسے مسافر سے دی ہے جسے اپنی منزل دُور محسوس ہوئی اور سفر کٹھن نظر آیا اور وہ راہ کی سردی گرمی سے خوفزدہ ہو گیا تو وہ کم ہمتی کا شکار ہو کر ایک درخت کے سائے میں پڑ کر سو گیا۔ اس درخت کے نیچے چیونٹوں کے سوراخ تھے۔ اُنہوں نے اُسے تر نوالہ سمجھ کر اس پر حملہ کر دیا اور اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھانے لگے۔

نیند کا ماتا اس مسلسل اذیت سے بار بار کراہتا۔ کبھی اس طرف پہلو بدلتا کبھی اس طرف۔ کبھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا اور کبھی سُستی کا شکار ہو کر پھر لیٹ جاتا۔ کبھی آنکھیں کھولتا، کبھی بند کر لیتا، کسمساتا اور جھلاتا اور ادھ کچری نیند میں بار بار چیونٹوں کو اپنے جسم سے توڑ توڑ کر پرے پھینکتا مگر وہ دو کو پرے

پھینکتا تو سو اور حملہ آور ہو جاتے ۔

مسافر لیٹا تو اس لیے تھا کہ سفر کی صعوبتوں سے گھبراتا تھا اور تن آسانی کا شکار تھا، مگر لیٹ کر بھی صعوبتیں ساتھ ہی رہیں اور کوئی آسانی اور راحت میسّر نہ آئی اور منزل جو کھوئی ہوئی وہ علیحدہ!

تو کیا پھر نادان کے لیے بہتر نہیں کہ غفلت کو جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور منزل کا رُخ کر کے چل پڑے۔ اگر راہیں کٹھن اور اذیت دہ ہیں تو یہاں لیٹ کر بھی کونسا آرام میسّر آ رہا ہے۔ یہاں بھی تو اذیت ہی اذیت ہے۔ سفر کے دوران آنے والی صعوبتیں تو آخر منزل تک پہنچائیں گی، مگر یہ صعوبتیں تو سرے سے ہلاک ہی ہو جانے کے خطرے میں مبتلا کر رہی ہیں!!!

داعی کے اوصاف

جو خوش قسمت اور عقلمند لوگ اپنی زندگی کے مشن کو سمجھ لیں اور دعوتِ دین کا فریضہ سرانجام دینے کا عزم کر لیں، اُن کا پہلا قدم خود اپنی اصلاح ہے۔ جب تک خود اُن کے اپنے اندر خاص خاص صفات پیدا نہ ہو جائیں گی، تو قع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دوسروں کے دل بدلنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

یہ مطلوبہ صفات بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ صفات جو کسی انسان کو ذاتی طور پہ نیک بناتی ہیں اور دوسری وہ جو اسے اس قابل بناتی ہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر چل سکے اور ان کے خیالات پہ اثر انداز ہو سکے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ذاتی طور پہ نیک ہو وہ لازماً ایک اچھا داعی بھی ثابت ہو سکے۔

مثال کے طور پہ ایک شخص بڑا دیانتدار اور امین ہے مگر ساتھ ہی انتہائی غصیلا بھی ہے اور ذرا ذرا سی خلافِ طبع بات پر ناراض ہو کر ساتھیوں کی طرف سے دل میلا کر لیتا ہے۔ ایک انسان انتہائی سچا ہے اور جھوٹ کے قریب بھی نہیں پھٹکتا مگر زبان کا کڑوا اور مزاج کا سخت ہے اور سچ بولتے ہوئے بھی ایسا انداز اختیار کرتا ہے جو دوسروں کے سینے سے پار ہو جائے۔

ایک شخص نماز روزے کا پابند اور حج و زکوٰۃ پہ کاربند ہے۔ مگر اس میں دوسروں کی زیادتیوں اور مخالفتوں کو سہہ کر معاف کر دینے کی صلاحیت نہیں۔

ایک شخص دین سے قلبی محبت رکھتا ہے۔ مگر دین کی راہ میں کی جانے والی کوششوں کے نتائج کا صبر سے انتظار نہیں کر سکتا بلکہ ان کے جلد نظر آ جانے کا متوقع رہتا ہے اور جب یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو دل برداشتہ ہونا شروع کر دیتا ہے۔

ایک شخص بڑا متقی پرہیز گار ہے اور ہر اس خرابی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جسے گناہ کا نام دیا جا سکے۔ مگر دعوتِ دین کی راہ میں آنے والی بے شمار ذہنی، جسمانی اور مالی آزمائشوں کو خندہ پیشانی سے سہہ کر ثابت قدم اور اولوالعزم رہنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اب اس کی دیانت و امانت، اس کی سچائی، اس کی صوم و صلوٰۃ کی پابندی، اس کی حبّ دین، اس کا تقویٰ اور پرہیز گاری اسے انفرادی طور پر ایک بڑا نیک انسان تو بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ ان پسندیدہ صفات کے ساتھ متصف ہونے کے ساتھ ساتھ ہی مزاج کا سخت، طبیعت کا غصیلا اور زبان کا کڑوا ہے۔ حلم و عفو کی صلاحیت نہیں رکھتا، صبر و استقامت سے کام نہیں لے سکتا اور اپنی کوششوں کے نتائج کو جلد سے جلد دیکھ لینے کا متمنی رہتا ہے تو وہ اپنی ساری نیکی کے باوجود ایک اچھا داعی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ دعوتِ دین ایک اجتماعی چیز ہے جس میں دوسروں کے ساتھ گہرا تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے دوسروں کے ساتھ مل کر چل سکنے کی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایک غصیلا، تلخ زبان، سخت مزاج، بے صبر اور جلد باز انسان اس میدان میں زیادہ دُور تک نہیں جا سکتا۔

لہٰذا ایک اچھا داعی بننے کے لیے ضروری ہے کہ جہاں ایک طرف انسان ذاتی طور پر نیک ہو وہاں دوسری طرف اس میں وہ صفات بھی موجود ہوں جو اسے اس قابل بنائیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر چل سکے۔ جب تک انسان ذاتی طور پر نیک نہ ہو، ظاہر ہے کہ وہ تبلیغ کے میدان میں پاؤں ہی نہیں دھر سکتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ۔ (الصف: ۲)

"اے ایمان والو، کیوں کہتے ہو وہ بات جو خود کرتے نہیں۔"

اگر اس میں دوسروں کے ساتھ مل کر چل سکنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے تو پھر اگر وہ تبلیغِ دین کی راہ پر چل بھی کھڑا ہوا تو زیادہ دُور تک نہیں جا سکے گا۔ یا تو وہ دل برداشتہ ہو کر اس کام سے ہی ہاتھ اٹھا لے گا یا پھر خود بھی پریشان رہے گا اور اپنے ساتھ کام کرنیوالوں کو بھی پریشان کرتا رہیگا۔

اب ہم انبیائے کرامؑ اور داعیانِ عظام کی زندگیوں کی روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ ایک اچھے داعی میں کیا کیا صفات ہونی چاہئیں۔

اخلاص

داعی کی صفات میں ایک بڑی صفت اخلاص ہے یعنی تبلیغ دین کے سلسلے میں اس کی ساری تگ و دو صرف اس لیے ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو اور اس کا دین سربلند ہو۔ اس لیے نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ اس راہ میں کوئی اہمیت یا جاہ و منصب حاصل کرے یا اہلِ دنیا کی تعریف و توصیف کا حقدار ٹھہرے۔ جس شخص نے تبلیغ دین کر کے پھر کوئی دنیاوی اہمیت یا فائدہ چاہا، اُس نے درحقیقت بڑا ہی خسارے کا سودا کیا۔

تبلیغ دین ہمیشہ سے ایک بڑا مشکل کام رہا ہے اور پھر موجودہ دور میں جب غیر اسلامی نظریات نے دنیا کو بُری طرح اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ خدا کے دین کی تبلیغ کرنا تو اور بھی زیادہ کٹھن کام ہو چکا ہے۔ اس راہ میں جان، مال، عزت، شہرت راحت، آرام ہر شئے کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اب جو شخص اس کٹھن راہ سے بھی گزرے اور ساتھ ہی اُس کے دل کے کسی کونے میں دنیاوی اہمیت حاصل کرنے کی خواہش کے بت کے بیٹھے ہونے کے باعث اس کا سارا کیا دھرا برباد بھی ہو جائے تو پھر اندازہ لگائیے کہ اس نے کیسا خسارے کا سودا کیا۔

ایک شخص کسی دینی موضوع پر تقریر کر رہا ہے۔ مگر اس سے لوگوں کو دین کی طرف مائل کرنے کی خواہش کے ساتھ ہی اس کے دل میں یہ تمنا بھی مچل رہی ہے کہ لوگ میری فصاحت و بلاغت پر سر دھنیں، تو پھر اس کا مطلب واضح طور پہ یہی ہے کہ اس کی لوگوں کو دین کی طرف مائل کرنے کی خواہش میں پورا خلوص موجود نہیں۔ ورنہ اس کے ساتھ یہ خواہش کیوں ابھر آئی کہ لوگ میری قوتِ تقریر اور زباندانی سے مرعوب ہوں۔

اسی طرح کوئی شخص بذریعہ تحریر دعوت دین دے رہا ہے اور ساتھ ہی اس کے دل میں یہ تمنا بھی ہے کہ پڑھنے والے میری تعریف کریں کہ میں کتنا عمدہ لکھنے والا ہوں، تو پھر بس اس کا یہی مطلب ہوا کہ اپنی تحریروں کے ذریعے جو وہ تبلیغ دین کر رہا ہے، اس میں پورا اخلاص نہیں۔ جن صالحین کے دلوں میں دعوت دین کے لیے واقعی پورا خلوص ہوتا ہے، وہ ان باتوں کا بھی دھیان رکھتے ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ کے سوانح نگار لکھتے ہیں:

"جب آپ کوئی خطبہ دیتے یا کوئی تحریر لکھتے اور اس کے متعلق دل میں غرور پیدا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تو بولتے بولتے چپ ہو جاتے اور تحریر پھاڑ ڈالتے اور فرماتے: "خدایا میں اپنے نفس کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں"۔

دین کے لیے خلوص کے ساتھ کام کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ دلوں میں فخر و غرور نہ آنے پائے۔ جو لوگ واقعی اخلاص کے ساتھ اپنے رب کے دین کی سربلندی کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ کبھی بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ انہیں بہت اہمیت دی جائے یا ان کی تعریف کے گن گائے جائیں۔ اپنے عظیم مقصد کے پیشِ نظر اپنے اعمال انہیں اتنے معمولی معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کا عام میلان خاکساری اور انکسار کی طرف ہوتا ہے نہ کہ فخر و غرور اور خودستائی کی طرف! ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے اُن کی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا:

"مجھے جو حال اپنے نفس کا معلوم ہے اگر تمہیں معلوم ہوتا تو تم میرے چہرے کی طرف دیکھتے بھی نہ!"

آپ نے اپنے مختصر سے عہد حکومت میں تبلیغِ دین کے لیے جتنی کوششیں فرمائیں اُن کی کہانیاں مسلمان آج تک بیان کرتے چلے آرہے ہیں مگر خود آپ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو لوگوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ مدینہ منورہ میں جاکر وفات پاتے تو رسولِ خداؐ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس دفن ہوتے (اس مدفن پاک میں ایک اور قبر کی جگہ موجود ہے) یہ سن کر آپؒ بولے:

"خدا کی قسم، آگ کے سوا اگر خدا تعالیٰ مجھے ہر قسم کا عذاب دے تو میں اس کو بخوشی

برداشت کروں گا، لیکن یہ گوارا نہیں ہے کہ خدا کو یہ معلوم ہو کہ میں اپنے آپ کو رسولِ خدا کے پہلو میں دفن کیے جانے کے قابل سمجھتا ہوں۔"

جب آپ وفات پانے کے قریب تھے تو بار بار اس آیت کی تلاوت کرتے تھے:
"یہ آخرت کا گھر ہے (جو) ہم اُن لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو زمین میں نہ تفوق چاہتے ہیں، نہ فساد کرتے ہیں اور عاقبت صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے"۔ (القصص: ۸۳)

خدمتِ دین کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا نام بھی بڑے بڑے ناموں میں سے ہے۔ آپ غیر معروف اور گمنام رہنے کو اتنا پسند فرماتے تھے کہ ایک دفعہ کسی سبیل پر پانی پینے کے لیے پہنچے۔ وہاں بھیڑ لگی تھی، لوگوں کا ریلا جو آیا تو آپ دُور جا گرے۔ واپسی میں اپنے ساتھی سے کہنے لگے۔ "زندگی ہو تو ایسی ہی ہو کہ نہ لوگ ہمیں پہچانیں اور نہ ہمیں کوئی بڑی چیز سمجھیں"۔

مرو کے شہر میں آپ کا ایک بہت بڑا مکان تھا۔ لوگوں کے دلوں میں آپ کے لیے اتنی عقیدت پیدا ہو گئی تھی کہ اس مکان پر ہر وقت شاگردوں اور عقیدت مندوں کی بھیڑ رہنے لگی۔ کچھ دیر تو آپ نے برداشت کیا۔ مگر جب دیکھا کہ روز بروز لوگوں کی زیادتی ہی ہوتی جارہی ہے تو اس مکان کو چھوڑ کر کوفے چلے گئے اور وہاں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے لگے۔

ان پُرخلوص صالحین کی زندگیوں کے واقعات کی روشنی میں غور کرنا چاہیے کہ اگر کوئی انسان دین کی تھوڑی سی خدمت کرکے یہ توقع رکھے کہ اب اس کا بہت زیادہ احترام کیا جائے یا اُس کی دینی خدمات کو سراہا جائے یا اُسے کوئی منصب عطا کیا جائے یا اس کے احکام بے چوں وچرا مانے جائیں یا اُسے نکتہ چینی سے بالا سمجھا جائے، تو اس نے گویا اپنی خدمات کا عوض انسانوں سے چاہا حالانکہ تبلیغِ دین وہ رفیع الشان خدمت ہے کہ انسان کسی صورت میں بھی اس کا اجر نہیں دے سکتے۔ اس کا اجر تو وہ قادرِ مطلق ہی دے سکتا ہے جس کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ کوئی کام کہنے کو تو اس کی خاطر کیا جائے مگر ساتھ ہی اس سے دنیائے دنی کے فوائد بھی پیشِ نظر رکھے جائیں۔

کلامِ پاک میں سورۂ ہود، آیات ۵۰ اور ۵۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

" اور قومِ عاد کی طرف ہم نے اُن کے بھائی ہُودؑ (نبی) کو بھیجا۔ اس نے کہا۔ اے برادرانِ قوم، اللہ کی بندگی کرو۔ تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادرانِ قوم، اس کام پہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے ..... "

سورۂ یوسف، آیات ۱۰۳ اور ۱۰۴ میں ارشاد ہوا ہے :

" (اے نبیؐ) مگر تم خواہ کتنا ہی چاہو ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ حالانکہ تم ان سے اس خدمت پہ کوئی اجر بھی نہیں مانگتے، یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔"

خواجہ حسن بصریؒ فرماتے ہیں

" جنّت جیسی جگہ تمہارے چند روزہ اعمال کا بدلہ نہیں بلکہ تمہارے اخلاص کا اجر ہے۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں :

" لکڑی کی تلوار مدافعت کے کام نہیں آتی، البتہ چولھے میں جلائی جا سکتی ہے۔ یہی حال اُن اعمال کا ہے جن میں اخلاص نہ ہو۔"

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں :

" صوفی وہ ہے جو
حضرت ابراہیمؑ کا سا مطیعِ خداوند،
حضرت اسمٰعیلؑ کا سا پیکرِ تسلیم،
حضرت ایوبؑ کا سا صابر،
حضرت موسیٰؑ کا سا سراپا شوق،
حضرت یحییٰؑ کا سا خاکسار، اور
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سا ہمہ تن خلوص ہو۔"

خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں :

"عارفوں کی فضیلت محبت (الٰہی) میں اخلاص ہے"۔
داعی اگر واقعی اس رفیع الشان کام کی اہمیت کو سمجھتا ہو تو اس کے دل میں خاکساری اور شکر گزاری کے جذبات روز بروز زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ جو شخص واقعی دین کی طرف دعوت دینے والا ہے اس کے دل کو فخر کرنے اور اپنی اہمیت جتانے کی خواہش سے کیا تعلق! اس کے لیے تو اتنا ہی سکون کافی ہے کہ اللہ رب العالمین نے اسے اس قابل سمجھا کہ اس سے اپنے دین کی خدمت لے۔ فارسی کا ایک شعر ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی
منت شناس اُز دکہ بخدمت گذ اشست

(اس بات کا احسان نہ رکھ کہ تو بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ بادشاہ کا یہ احسان مان کہ اس نے تجھے اپنی خدمت کرنے دی)
خلوصِ دل سے کی ہوئی تھوڑی سی خدمت بھی اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت بڑی ہوتی ہے۔
حضرت عبداللہ منازل فرماتے ہیں:
"بغیر دکھاوے کے ایک سانس کی برکت بھی آخرت تک باقی رہے گی"۔
تبلیغِ دین اگر پورے خلوص سے ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے اس میں ضرور اثر پیدا کرتا ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:
"جو نصیحت غرض سے خالی ہو، وہ کڑوی دوا کی طرح بیماری کو دُور کرنے والی ہوتی ہے"۔
کہا جاتا ہے کہ بڑے بڑے پرخلوص انسانوں کے دلوں کے اندر بھی یہ خواہش ضرور چھپی بیٹھی رہتی ہے کہ ہمارے اچھے اعمال کو کوئی دیکھے اور تعریف کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انسانی دل کے اندر اس خواہش کا ہونا ایک لازمی بات ہے تو پھر ٹھیک ہے یہ بے شک رہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ دیکھنے والا اور تعریف کرنے والا ہو کون۔ آخر وہ "کوئی"، اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات بھی تو ہو سکتی ہے۔ اگر وہ خود

کسی عمل کو تعریفیہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہو، تو پھر اس کی تعریف سے بڑھ کر عزت دینے والی تعریف اور کس کی ہو سکتی ہے اور اس کے سوا اور کون ایسی ہستی ہے جو چھوٹے سے چھوٹے اور حقیر سے حقیر عمل کو بھی دیکھ لیتی اور قدر دانی کرتی ہے۔ سورۂ لقمان، آیت ۱۶ میں حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اے میرے بیٹے، اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر ہو، پھر وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا وہ آسمانوں کے اندر ہو یا وہ زمین کے اندر ہو، تب بھی اُس کو اللہ تعالیٰ حاضر کر دے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین، باخبر ہے"۔

دعوتِ دین کے لیے کوئی تگ و دو کرتے ہوئے یا کوئی اور اچھا عمل کرتے ہوئے آخر یہ کیوں نہ تصوّر رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ خود بنفسِ نفیس اسے دیکھ رہا ہے اور پسند کر رہا ہے اور اگر ہم نے کسی انسان کی تعریف یا پسندیدگی کو مقصود بنا لیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی یہ پسندیدگی ختم ہو جائے گی۔

اگر انسان اپنے سوچنے کے انداز کو اس ڈھب پہ لانے کی مسلسل کوشش کرتا رہے تو انشاءاللہ اس کی فطرت کا یہ تقاضا بھی پورا ہوتا رہے گا کہ کوئی میرے اچھے اعمال کو دیکھے اور تعریف کرے اور اس کے اعمال بھی مخلصانہ رہیں گے۔ اور تحریکِ اسلامی بہت سی ایسی الجھنوں اور بے چینیوں سے بھی بچی رہے گی جو اُسے اس وقت لاحق ہو جاتی ہیں، جب دعوتِ دین دینے والے اپنی اپنی اہمیت جتانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اہلِ دنیا کو اعلیٰ و ارفع بن کر دکھانے، ان کی تعریف و توصیف حاصل کرنے اور اپنی اہمیت جتانے کی خواہش عموماً ہر انسان ہی کے لیے خرابی کا باعث بنتی ہے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے یہ خواہشات اُن لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جائیں جنہوں نے تبلیغِ دین کو مقصد بنا رکھا ہو، تو پھر تو یہ دعوتی جدوجہد کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہوتی ہیں کیونکہ داعی لوگ اپنی اپنی اہمیت جتانے کی کوشش میں بسا اوقات خود ایک دوسرے ہی سے ٹکرا جاتے ہیں اور دعوتِ دین کی مہم کو وہ نقصان پہنچا دیتے ہیں جو مخالفین کی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں نے بھی نہ پہنچایا ہو۔

لہٰذا داعیانِ دین کے لیے یہ بے انتہا ضروری ہے کہ وہ انتہائی بے غرضی اور بے نفسی سے کام

کریں اور اپنے اعمال صرف اللہ رب العالمین ہی کو دکھا کر تسکین حاصل کریں اور صرف اسی سے قدر دانی اور تعریف کے متوقع ہوں۔ اپنے ہی جیسے کمزور انسانوں کی قدر دانی اور تعریف حاصل کرنے کے کبھی روادار نہ ہوں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا فرمان ہے:

"علم، عمل اور اخلاص۔ جب تک یہ تینوں اجزاء کامل نہ ہوں شریعت کبھی متحقق نہیں ہوتی"۔

دین کی دعوت دینے والوں کی زندگی میں جس طرح وہ اوقات اکثر آتے ہیں جب کہ ان کے دل شکستہ ہونے اور ہمت ہار جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ اوقات بھی آجاتے ہیں جب کوئی کامیابی ان کے فخر و غرور میں مبتلا ہونے کا خدشہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ دونوں صورتیں دعوتِ دین کی مہم کے لیے یکساں طور پر خطرناک ہوتی ہیں۔ اگر داعی راہ کی دقتوں سے دل شکستہ ہو گیا تو بھی دعوت کو نقصان پہنچا اور اگر وہ کسی کامیابی کو دیکھ کر فخر اور خودستائی میں مبتلا ہو گیا تو بھی دعوت کو نقصان پہنچا۔

اوّل الذکر صورت میں نقصان پہنچنا تو بالکل واضح ہے کہ اگر ایک داعی نے دل شکستہ ہو کر کام چھوڑ دیا تو دعوت کا ایک کارکن کم ہو گیا۔ اب جتنا کام اس کو کرنا تھا، وہ نہیں ہو گا۔

آخر الذکر صورت میں نقصان اس طرح ہو گا کہ فخر اور خودستائی میں وہی مبتلا ہوتا ہے جو سمجھتا ہے کہ میں نے بہت کچھ کر لیا۔ حالانکہ امتِ مسلمہ کا جو اصل فریضہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ تمام بنی نوعِ انسان کو خدا کا پیغام پہنچانے کی کوشش کرے اور یہ کام اتنا لمبا، اتنا وقت طلب اور مشقت طلب ہے کہ ہم میں سے کوئی اپنی پوری زندگی بھی اس راہ میں کھپا دے تو وہ اصل کام کا بہت تھوڑا سا حصّہ ہی کر سکے گا۔

اب جو شخص تھوڑی سی مدت تبلیغی کام کرکے اور یہ دیکھ کر کہ وہ کچھ لوگوں کو راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہو گیا ہے، فخر اور خودستائی میں مبتلا ہو جائے، وہ درحقیقت اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے اصل کام کی وسعت کا احساس ہی نہیں۔

مثال کے طور پر اگر آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا تعلق ایک ایسے گروہ سے ہے جس کو ناخنوں سے مٹی کھود کھود کر کنواں تیار کرنا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدھا تولہ مٹی نکال کر آپ فخر میں آجائیں کہ میں نے بڑا کارنامہ سرانجام دے لیا ہے — اور وہ جو پورے کا پورا کنواں

ابھی پڑا ہے کھُدنے والا؟ ــــ وہ ساری مشقت جو ابھی کی جانی ہے، اس کے مقابلے میں یہ آدھا تولہ مٹی کی کیا حیثیت ہے کہ اسے نکالنے والا یہ سمجھنا شروع کر دے کہ میں نے کوئی بہت بڑی مہم سر کر لی ہے!۔

یہ ٹھیک ہے کہ کنواں اس سارے گروہ کو کھودنا ہے صرف آپ کو نہیں کھودنا اور جو آدھا تولہ مٹی آپ نے کھودی ہے اس نے بھی کنواں تیار ہونے میں امداد ہی دی ہے اور اگر سب آدھا آدھا تولہ ہی نکالتے جائیں گے تو آخر ایک دن کنواں تیار ہو ہی جائے گا تاہم چونکہ اصل کام کی بے پناہ وسعت اور مشکلات کے آگے آدھا تولہ مٹی کی حیثیت کچھ بھی نہیں بنتی، اس لیے فخر میں آنے کے لیے قطعی طور پہ کوئی جواز نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی انسان میں بھی یہ سکت نہیں ہو سکتی کہ وہ تنہا اس کنویں کو کھود لے۔ کنواں تو بہت سے لوگ مل کر ہی کھودیں گے اور ہر انسان ایک محدود حد تک ہی کام کر سکے گا تاہم بہت زیادہ فرق ہو گا، اس انسان میں جسے ہمیشہ یہ یاد رہے کہ اصل نصب العین پورا کنواں کھودنا ہے اور اس انسان میں جو کچھ مٹی کھود لینے ہی کو نصب العین بنائے ہوئے ہے۔

جس شخص کو اس بات کا احساس ہے کہ کنواں پورے کا پورا کھودنا ہے، وہ بھی اگرچہ اتنا ہی کام کر سکے گا جتنی اس میں سکت ہو گی، تاہم وہ کبھی اپنی کوششوں کو کافی نہیں سمجھے گا اور اصل کام کے پیشِ نظر اسے اپنی تھوڑی سی کھودی ہوئی مٹی ہمیشہ معمولی معلوم ہوتی رہے گی۔ لہٰذا اس کے فخر و خود ستائی میں مبتلا ہونے کا امکان بہت کم ہے اور اس چیز کا امکان زیادہ ہے کہ وہ اپنی مشقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتا رہے اور ان کوششوں کو آخری دم تک جاری رکھے ــــ ظاہر ہے یہ صورتِ حالات کنویں کے نسبتاً جلد کھُد جانے میں مددگار ہو گی۔

اس کے برعکس جو شخص اس بات کا احساس نہیں رکھتا ہو گا کہ اصل کام پورے کا پورا کنواں کھودنا ہے بلکہ وہ کچھ مٹی کھود لینے ہی کو نصب العین بنائے ہو گا۔ وہ جب ذرا بھی محسوس کرے گا کہ اس کی کھودی ہوئی مٹی کسی دوسرے کی کھودی ہوئی مٹی سے کچھ زیادہ ہے تو اس کے فخر میں آجانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ اس میں اتنی دور اندیشی نہیں کہ وہ

یہ دیکھ سکے کہ پورا کنواں تیار کرنے کے لیے جتنی مٹی کھودی جانی ہے اس کے مقابلے میں میری کھودی ہوئی یہ مٹی بالکل حقیر مقدار میں ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس کی مٹی کسی اور کی مٹی سے کچھ زیادہ ہے۔

اب جو شخص مطمئن ہو گیا کہ میں نے بہت کام کر لیا ہے، خطرہ ہے کہ اس کے کام کی رفتار سست پڑ جائے گی ـــــ اور اگر کنواں کھدوانے والا مالک فخر و خود ستائی سے نفرت رکھنے والا ہے تو عجب نہیں کہ وہ اس شیخی باز کا کان پکڑ کر اسے اس کام ہی سے علیحدہ کر دے کہ تم نے آخر کون سے تیر مار لیے تھے کہ بیٹھ کر اپنی بڑائی شروع کر دی ہے ـــــ اس طرح بھی ظاہر ہے کہ کنواں کھودنے والے ہاتھوں میں سے دو ہاتھ کم ہی ہو جائیں گے۔

یہی حال اس وقت فریضۂ دعوتِ دین کا ہے۔ دنیا کی آبادی اربوں میں ہے اور ان میں سے مسلمان اندازاً ستّر اسّی کروڑ کے اردگرد بتائے جاتے ہیں اور ان ۷۰، ۸۰ کروڑ میں سے بھی غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بقول علامہ اقبالؒ

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغاں بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلماں بھی ہو

اور صرف یہی نہیں کہ مسلمان اسلام سے دُور ہو چکے ہیں بلکہ جب کوئی اسلام کی طرف بلاتا ہے تو سب سے پہلے خود مسلمان کہلانے والے ہی بڑھ کر مخالفت کرتے ہیں۔ اس صورتِ حالات میں جن لوگوں نے دعوتِ دین کا کام شروع کر رکھا ہے، اگر انہیں واقعی اس بات کا احساس ہے کہ یہ دعوت، ساری دنیا تک پہنچانی ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اردگرد کے چند انسانوں تک بات پہنچا کر یا چند تقریریں کر کے یا چند تحریریں لکھ کر وہ اس گمان میں مبتلا ہو جائیں کہ ہم نے تو بہت کچھ کر لیا ہے اور اب ہم فخریہ گفتگو کرنے یا جی ہی جی میں فخر کرنے میں حق بجانب ہو گئے ہیں۔ ایسا تو وہی کر سکتا ہے جسے اس بات کا احساس نہ ہو کہ بات چند انسانوں تک نہیں ساری دنیا تک پہنچانی ہے اور اس حالت میں پہنچانی ہے کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی زبان طعن

اور دست ظلم دراز کیے کھڑے ہیں۔ لہٰذا جو شخص واقعی خلوص دل سے خدا کے دین کی خدمت کرنا چاہے اور جسے احساس ہو کہ جو کچھ میں کرنا چاہ رہا ہوں وہ کتنا مشکل اور کتنا وقت طلب ہے۔ وہ فخر اور خودستائی سے بہت دور رہوگا۔ حضرت عثمان رضؓ کا مقولہ ہے:

"سخاوت پھل ہے مال کا، عمل پھل ہے علم کا اور رضائے الٰہی پھل ہے اخلاص کا۔"

قلب و دل و نگاہ کا مُرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات (اقبالؒ)

۹ھ میں مدینے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ شہنشاہ روم ہرقل ایک جرار لشکر کے ساتھ حملہ آور ہونے والا ہے۔ قرائن اس افواہ کی تصدیق کرتے تھے۔ لہٰذا حضورؐ نے فوج تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس زمانے میں قحط اور سخت گرمیاں تھیں، اس لیے سفر کرنا بے انتہا مشکل تھا۔ مدینے میں ایک گروہ منافقین کا بھی موجود تھا۔ وہ خود بھی جہاد میں جانے سے جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار کا لشکر لے کر شام کی سرحد کی طرف تبوک کی جانب چلے تو بعض لوگ کسی نہ کسی حیلے بہانے رُک گئے۔ ان رک جانے والوں میں اکثریت تو منافقین ہی کی تھی۔ مگر بدقسمتی سے کچھ مخلص مسلمان بھی سُستی کے باعث نہ جا سکے۔ ان میں سے ایک صحابی حضرت کعب بن مالک رضؓ تھے اور باقی دو حضرت مرارہؓ بن ربیع اور حضرت ہلال بن امیہ رضؓ تھے۔ حضرت کعبؓ نے اپنا قصہ خود بیان کیا ہے جو بہت سبق آموز ہے۔ اپنے بڑھاپے کے زمانے میں جب وہ نابینا ہو گئے تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے جو اُن کا ہاتھ پکڑ کر چلایا کرتے تھے، یہ قصہ خود بیان کیا۔ فرماتے ہیں:

"غزوہ تبوک کی تیاری کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں سے شرکت جنگ کی اپیل کرتے تھے۔ میں اپنے دل میں ارادہ کر لیتا تھا کہ چلنے کی تیاری کروں گا۔ مگر پھر واپس آکر سستی کر جاتا تھا اور کہتا تھا کہ ابھی کیا ہے، جب چلنے کا وقت آئے گا تو تیار ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ اسی طرح بات ٹلتی رہی، یہاں تک کہ لشکر کی روانگی کا وقت

آگیا اور میں تیار نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ لشکر کو چلنے دو میں ایک دو روز بعد راستے ہی میں اس سے جا ملوں گا۔ مگر پھر وہی سستی مانع ہوئی حتیٰ کہ وقت نکل گیا۔

اس زمانے میں جبکہ میں مدینے میں رہا۔ میرا دل یہ دیکھ دیکھ کر بے حد کڑھتا تھا کہ میں پیچھے جن لوگوں کے ساتھ رہ گیا ہوں، یا تو منافق ہیں یا وہ ضعیف اور مجبور لوگ جن کو اللہ نے معذور رکھا ہے۔

جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تبوک سے واپس تشریف لائے تو حسبِ معمول آپؐ نے پہلے مسجد آکر دو رکعت نماز پڑھی پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھے۔ اس مجلس میں منافقین نے آکر اپنے عذرات لمبی چوڑی قسموں کے ساتھ پیش کرنے شروع کیے۔ یہ اسیؔ سے زیادہ آدمی تھے۔ حضورؐ نے اُن میں سے ایک ایک کی بناوٹی باتیں سنیں۔ اُن کے ظاہری عذرات کو قبول کر لیا اور ان کے باطن کو خدا پر چھوڑ کر فرمایا۔ "خدا تمہیں معاف کرے"۔

پھر میری باری آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ آپؐ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: "تشریف لائیے۔ آپ کو کس چیز نے روکا تھا؟"

میں نے عرض کیا: "خدا کی قسم، اگر میں اہلِ دنیا میں سے کسی کے سامنے حاضر ہُوا ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی بات بنا کر اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا۔ باتیں بنانی تو مجھے بھی آتی ہیں۔ مگر آپؐ کے متعلق میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے میں نے آپؐ کو راضی بھی کر لیا تو اللہ ضرور آپؐ کو مجھ سے پھر ناراض کر دے گا۔ البتہ اگر سچ کہوں تو چاہے آپؐ ناراض ہی کیوں نہ ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ میرے لیے معافی کی کوئی صورت نکال دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے جسے پیش کر سکوں۔ میں جانے پر پوری طرح قادر تھا۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا: "یہ شخص ہے جس نے سچی بات کی۔ اچھا اٹھ جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تمہارے معاملے میں کوئی فیصلہ کر دے۔" میں اٹھا اور اپنے قبیلے کے لوگوں میں جا بیٹھا۔ یہاں سب کے سب میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے بہت ملامت کی کہ تو نے کوئی عذر کیوں نہ کر دیا۔ یہ باتیں سن کر میرا نفس بھی کچھ آمادہ ہونے لگا کہ پھر حاضر ہو کر کوئی بات بنا دوں۔ مگر جب

مجھے معلوم ہوا کہ دو اور صالح آدمیوں (مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ) نے بھی وہی سچی بات کہی ہے جو میں نے کہی تھی تو مجھے تسکین ہو گئی اور میں اپنی سچائی پر جما رہا۔

اس کے بعد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عام حکم دے دیا کہ ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے۔ وہ دونوں تو گھر بیٹھ گئے مگر میں نکلتا تھا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرزمین بالکل بدل گئی ہے، میں یہاں اجنبی ہوں اور اس بستی میں کوئی بھی میرا واقف کار نہیں۔ مسجد میں نماز کے لیے جاتا تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا تھا، مگر بس انتظار ہی کرتا رہ جاتا تھا کہ جواب کے لیے آپؐ کے ہونٹ جنبش کریں۔ نماز میں نظریں چرا کر حضورؐ کو دیکھتا تھا کہ آپؐ کی نگاہیں مجھ پر کیسی پڑتی ہیں۔ مگر وہاں حال یہ تھا کہ جب تک میں نماز پڑھتا آپؐ میری طرف دیکھتے رہتے اور جہاں میں نے سلام پھیرا کہ آپؐ نے میری طرف سے نظر ہٹائی۔

ایک روز میں گھبرا کر اپنے چچا زاد بھائی اور بچپن کے دوست ابو قتادہ کے پاس گیا اور ان کے باغ کی دیوار پر چڑھ کر انہیں سلام کیا۔ مگر اس اللہ کے بندے نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا۔ "ابو قتادہ، میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا میں خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت نہیں رکھتا؟" وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر پوچھا۔ وہ پھر خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ جب میں نے قسم دے کر یہی سوال کیا تو انہوں نے بس اتنا کہا کہ "اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔" اس پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں دیوار سے اُتر آیا۔

انہیں دنوں ایک دفعہ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک شخص مجھے ملا اور اس نے شاہ غسان کا خط حریر میں لپٹا ہوا مجھے دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا:

"ہم نے سنا ہے تمہارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے۔ تم کوئی ذلیل آدمی نہیں ہو نہ اس لائق ہو کہ تمہیں ضائع کیا جائے۔ ہمارے پاس

آجاؤ، ہم تمہاری قدر کریں گے "۔

میں نے کہا یہ ایک اور بلا نازل ہوئی اور اُسی وقت اس خط کو چولھے میں جھونک دیا۔ چالیس دن اس حالت پر گزر چکے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آدمی حکم لے کر آیا کہ اپنی بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ۔ میں نے پوچھا، کیا طلاق دے دوں؟ جواب ملا، نہیں بس الگ رہو۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہُوا تھا اور اپنی جان سے بیزار ہو رہا تھا کہ یکایک کسی شخص نے پکار کر کہا "مبارک ہو کعب بن مالکؓ"۔ میں یہ سنتے ہی سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ میری معافی کا حکم ہو گیا ہے۔ پھر تو فوج در فوج لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے اور ہر ایک دوسرے سے پہلے پہنچ کر مجھے مبارکباد دے رہا تھا کہ تیری توبہ قبول ہو گئی۔

میں اٹھا اور سیدھا مسجد نبویؐ کی طرف چلا۔ دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے۔ میں نے سلام کیا تو فرمایا "تجھے مبارک ہو، یہ دن تیری زندگی میں سب سے بہتر ہے"۔ میں نے پوچھا کہ یہ معافی حضورؐ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے۔ فرمایا کہ خدا کی طرف سے اور یہ آیات سنائیں۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں۔ فرمایا "کچھ رہنے دو کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے"۔ میں نے اس ارشاد کے مطابق اپنا خیبر کا حصّہ رکھ لیا، باقی سب صدقہ کر دیا۔ (تفہیم، جلد دوم، صفحہ ۲۴۵)

کوئی ڈھانچہ چاہے کتنا ہی اعلیٰ پائے کا کیوں نہ ہو اُسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے اس کے اندر روح کا ہونا نہایت ضروری ہے، ورنہ وہ ڈھانچہ بے جان رہے گا اور بے جان ڈھانچے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا کرتے۔ کیونکہ ان کا بے جان ہونا انہیں غیر دلکش بنا دیتا ہے۔ اور ان کا غیر دلکش ہونا ان کے غیر ہر دلعزیز ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور غیر ہر دلعزیز نظام تغافل کا شکار ہوتے ہوتے آخر شکست و ریخت کا لقمہ بن جاتے ہیں۔

اسلام کا نظام زندگی ایک بڑا ہی ترقی یافتہ اور نہایت اعلیٰ پائے کا نظام ہے اور انسانی فطرت سے اتنی مطابقت رکھتا ہے کہ دنیا کا کوئی اور نظام زندگی اس معاملے میں اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس نظام کے بھی پورے طور پر فائدہ مند ہونے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس

کے اندر اس کی روح جاری وساری رہے۔ اسلامی نظام کی روح کیا ہے؟ —— اس نظام کے ساتھ، اس کے بھیجنے والے کے ساتھ اور اس کو لانے والے کے ساتھ گہری قلبی محبت یا اقبالؒ کے الفاظ میں عشق!

جب اسلامی نظام کی بنیاد عشقِ اسلام پہ رکھی جاتی ہے تو نتائج وہی نکلتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی زمانے میں نکلے تھے۔ ذرا مندرجہ بالا واقعے پر غور کریں کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے اُس معاشرے میں ایسا نقطۂ کمال پہ پہنچا ہوُا نظم وضبط اور ایسی بے مثال وفاداری پیدا کر دی تھی کہ جب قوم کے رہنما نے فرمایا کہ فلاں شخص سے کوئی بات نہ کرے تو پھر اس انسانوں سے بھری ہوئی آبادبستی میں ایک متنفس بھی ایسا نہ نکلا جو چوری چھپے بھی اس حکم کی خلاف ورزی کا تصوّر کر سکتا اور جب ایک شخص کو اس کی سُستی کی سزا دینے کے لیے اس کا بائیکاٹ کیا گیا تو اس نے پورے پچاس دن انتہائی شدید ذہنی اور قلبی اذیت میں گزار دیئے۔ مگر نہ تو اس کے منہ سے کوئی حرفِ شکایت نکلا اور نہ یہ خیال اس کے ذہن کے کسی اندرونی گوشے میں بھی آسکا کہ وہ اس "سخت گیر" معاشرے سے علیحدگی اختیار کرلے بلکہ جب ایک مخالفِ اسلام ہستی نے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھانے کی خاطر امداد اور عزت افزائی کی پیش کش کی تو اس نے اس پیش کش کو بھی ایک ابتلاء سمجھا اور بلا تامل اسے چولھے میں جھونک دیا۔ اس سارے نظم وضبط اور مثالی وفاداری کی تہہ میں اس کے سوا اور کیا تھا کہ ان نیکوکاروں کو خدا، رسولؐ اور دینِ متین سے انتہائی شدید قسم کی محبت تھی اور اس محبت نے اُن کے پورے نظامِ زندگی کو ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا تھا کہ کوئی رخنہ انداز اس مستحکم معاشرے میں رخنہ پیدا کرنے سے عاجز تھا۔

ہجرت کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو یہاں آپؐ نے مسلمانوں اور یہود کے درمیان ایک معاہدہ کروایا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے ساتھ گویا ایک آزاد اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس کے سربراہ حضورؐ تھے۔ دس گیارہ سال بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو یہ ریاست سارے عرب پہ محیط ہو چکی تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد یہ ریاست بتدریج پھیلتی چلی گئی اور جب خلافتِ راشدہ ختم ہوئی تو یہ ایک سلطنت کی شکل اختیار کر کے ایشیا اور افریقہ

دو براعظموں میں پھیل چکی تھی اور جب پہلی صدی ہجری ختم ہوئی تو یہ سلطنت تیسرے براعظم یورپ میں بھی گھس چکی تھی۔

یہ فتوحات صرف سیاسی فتوحات ہی نہیں تھیں بلکہ مسلمانوں نے جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کے باشندوں کے دلوں کو بھی فتح کر لیا! ان کے کلچروں، زبانوں اور مذہبوں کو بھی فتح کر لیا۔ مسلمانوں کی سلطنت ہی نہیں پھیلی بلکہ ساتھ ساتھ اُن کا دین اور اُن کا نظامِ زندگی بھی پھیلتا چلا گیا۔ بیشمار قوموں نے صرف میدانِ جنگ ہی میں اُن کے آگے سر نہیں جھکائے تھے بلکہ ان کے بے مثال نظامِ زندگی کے آگے بھی سر جھکا دیئے تھے۔ حبِّ دین کی بناء پر مسلمانوں کے کردار میں جو دلکشی پیدا ہو گئی اس نے غیر مسلموں پر حیرت انگیز اخلاقی اثر ڈالا تھا۔ تاریخی بیانات کے مطابق ہندوستان کے بعض ساحلی علاقوں میں مسلمان تاجروں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں اور غیر مسلموں پر اُن کے اخلاقی اثر کا یہ عالم تھا کہ جب لوگوں کو امانتیں رکھوانی ہوتیں تو وہ مسلمانوں کے پاس آ کر رکھوایا کرتے۔

پھر ہماری ہی تاریخ میں ایسے وقت بھی آئے جب یہ روحِ دین نظر انداز کر دی گئی اور لوگوں کے دلوں میں خدا، رسول[ص] اور دین کی محبت پیدا کرنے پر اتنا زور نہ دیا گیا جتنا اس بات پر دیا گیا کہ وہ اسلامی نظام کے ظاہری ڈھانچے کی پیروی کریں۔ اگرچہ اسلامی نظام کا ڈھانچہ بھی بے پناہ افادیت کا حامل ہے تاہم روح کے بغیر وہ اپنا پورا فائدہ نہیں دے سکتا تھا چنانچہ جب معاملہ صرف ظاہری ڈھانچے تک پہنچ گیا تو پھر قدرتی طور پر وہ نتائج نکلنے بھی بند ہو گئے جو پہلے جاندار نظام نے پیدا کیے تھے۔ تاریخ کے اس دور میں بھی اگرچہ بڑے بڑے علماء، فقہاء، فلسفی، سیاستدان، جرنیل، وزراء اور حکمران پیدا ہوتے رہے، لیکن چونکہ دین کے ساتھ صحت مندانہ قلبی محبت رکھنے والے کم ہو گئے تھے، اس لیے وہ پہلے کی سی بات نہ رہی۔ چنانچہ پہلے جاندار نظام نے جو سیاسی، روحانی، اخلاقی اور مذہبی سلطنت پھیلائی تھی، وہ کچھ مسلمانوں کی باہمی چپقلش کے باعث اور کچھ اغیار کی چیرہ دستیوں کے ذریعے، جو اب اس کمزور معاشرے میں آسانی سے رخنہ اندازیاں کر سکتے تھے، سمٹنی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آ گیا کہ مسلمان اپنے وطنوں کے اندر بے وطن ہو کر رہ گئے۔

اب جب ہم صدیوں کی تلخیاں سہنے کے بعد از سر نو اپنے کھوئے ہوئے دینی اور دنیوی قار کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ شروع ہی سے اس غلطی سے بچیں جس نے ہمارے عظیم الشان نظامِ زندگی کو بے روح کر دیا تھا۔ لہٰذا جو شخص بھی دعوتِ دین کے فریضے کو ادا کرنے کا کام شروع کرے، اس کے دل میں خدا، رسولؐ اور اسلام کے لیے گہری محبت اور جذبۂ فدائیت موجود ہونا چاہیے اور اسے اس بات کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے کہ جن سے وہ مخاطب ہو رہا ہے، ان کے دلوں میں بھی یہی جذبات پیدا ہوں۔ خدا، رسولؐ اور اسلام کا عشق وہ عمدہ بیج ہیں جن سے ایک پاکباز انفرادی زندگی اور ایک کامیاب صالح معاشرے کے برگ و بار خود بخود نکلتے چلے آتے ہیں۔ اگر ہم اپنے دلوں میں یہی شے پیدا نہ کر سکے تو ہمارا نظامِ زندگی ایک بے روح ڈھانچے سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ یا اقبالؒ کے الفاظ میں اس کی حیثیت "بت کدۂ تصورات" سے زیادہ نہ ہوگی۔ دین کو دل کی گہرائیوں سے چاہنے والوں ہی سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے دلوں میں ان جذبات کو پیدا کر سکیں گے۔ ورنہ جن کا اپنا دل اس آتشِ عشق سے خالی ہوگا، وہ دوسروں کے دلوں میں حرارت کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔

یہاں ایک غور طلب بات یہ ہے کہ ہماری تاریخ میں ان صوفیاء کا طبقہ کیسے پیدا ہو گیا، جنھوں نے رہبانیت کو شعار بنا لیا اور "طریقت" کے نام سے ایک نظام بنا کر اُسے شریعت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ حالانکہ اسلام کی سیدھی سادی اور انسانی فطرت سے پوری طرح مطابقت رکھنے والی تعلیم میں رہبانیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور جسے طریقت کا نام دیا گیا، وہ شریعت کی اپنی روح تھی نہ کہ کوئی مدِ مقابل چیز۔

مصنفین نے اس صورتِ حالات کی کئی وجوہ بتائی ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے کہ جب علماء اور اربابِ اقتدار نے لوگوں کے دلوں میں خدا، رسولؐ اور اسلام کی سچی محبت پیدا کرنے کی کوششوں کو نظر انداز کر کے صرف شرعی ڈھانچے کو منوانے پر زور دینا شروع کر دیا، تو ایک طبقے پر اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ وہ ضد میں آ کر ظاہری ڈھانچے کو نظر انداز کر کے روح ہی پر سارا زور صرف کرنے لگے۔ اس طرح اسلامی نظام کے ڈھانچے اور اس کی

روح کو دو علیحدہ علیحدہ چیزیں تصور کر کے ایک پر ایک گروہ نے قبضہ کر لیا اور دوسری پر دوسرے نے۔ شریعت کا ڈھانچہ اور روح مل کر ایک بے مثال نظام بن رہا تھا۔ انہیں علیحدہ علیحدہ کر کے ان انتہا پسندوں نے اس کا ستیاناس کر دیا۔

اب اقتدار چونکہ عموماً علمائے ظاہر کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور وہ انتہا پسند صوفیوں کو سزائیں بھی دیتے تھے اس لیے صوفیاء علماء کے اور بھی زیادہ مخالف ہو گئے اور علماء کی ضد میں آکر انہوں نے شریعت کے ظاہری ڈھانچے کی خوب مخالفت کی اور نادانی کے باعث نہ سمجھ سکے کہ ایسا کر کے وہ اپنے مخالفین کو نہیں بلکہ اپنے دین کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دوسری طرف کچھ صوفیوں کی ضد میں اور کچھ اپنی کم نگاہی کے باعث علمائے ظاہر نے بھی خالی ڈھانچے پر ہی سارا زور صرف کرنا شروع کر دیا اور اس طرح معاملے کو اور زیادہ بگاڑا۔

اگرچہ تاریخ میں ایسے مصلحین پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اسلامی نظام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ قائم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ تاہم انتہا پسندوں کی انتہا پسندی سے مضر نتائج پیدا ہونے ہی تھے۔ چنانچہ آج ہم انتہائی تلخی کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ روح کے بغیر ہمارا یہ نظام صرف ایک ڈھانچہ ہو کر رہ گیا ہے اور اب اس ڈھانچے پر عمل کرنے والے بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

دین کی دعوت دینے والوں کے لیے یہ یاد رکھنا لازمی ہے کہ جب تک ہم اپنے نظام کی بنیاد اس کی حقیقی روح پر نہ رکھیں گے، یا دوسرے الفاظ میں جب تک ہمارے دلوں میں دین کی سچی محبت اور اس کے لیے فدائیت کے وہ جذبات پیدا نہ ہوں گے جنہوں نے ہمارے اسلاف کو اقوامِ عالم کا امام بنا دیا تھا، تب تک ہم کسی حقیقی فائدے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ ہم نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کے کتنے ہی پابند کیوں نہ ہو جائیں، اگر ہمیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اسلام دنیا میں سربلند ہو رہا ہے یا سرنگوں، اور لوگ اس کی طرف آ رہے ہیں یا اسے چھوڑ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہ انفرادی صوم و صلوٰۃ کی پابندی ہمیں کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کو حکم بھیجا کہ فلاں بستی کو اس کے باشندوں سمیت الٹ دو۔ جبریلؑ نے عرض کی کہ اے رب! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے۔ جس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ حکم ہوا کہ اس پر اور تمام دوسروں پر اس کو الٹ دو، کیونکہ اس شخص کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر تھوڑی دیر کے لیے بھی نہیں تمتاتا۔ (مشکوٰۃ)

خدا، خدا کے رسولؐ اور خدا کے دین کی سچی محبت انسان کے اندر وہ دینی حمیت اور غیرت پیدا کرتی ہے جس کے باعث وہ گوارا نہیں کرتا کہ دین پر کسی قسم کی آنچ آئے یا مسلمان کسی مباح معاملے میں دوسروں سے پیچھے رہ جائیں۔

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ:

"سب انسانی اعمال کا دار و مدار بس نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت ہی کے مطابق پھل ملتا ہے۔ تو جس شخص نے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کی (اور خدا اور رسولؐ کی رضاجوئی و اطاعت کے سوا اس کی ہجرت کا اور کوئی باعث نہ تھا) تو اس کی ہجرت درحقیقت اللہ و رسولؐ ہی کی طرف ہوئی۔ اور جو کسی دنیاوی غرض کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی خاطر "مہاجر" بنا تو اس کی ہجرت اللہ و رسولؐ کے لیے نہ ہوگی بلکہ فی الواقع جس دوسری غرض اور نیت سے اس نے "ہجرت" اختیار کی ہے عند اللہ بس اس کی طرف اس کی ہجرت مانی جائے گی"۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث کا اصل منشاء امت پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ تمام اعمال کے صلاح و فساد اور مقبولیت و مردودیت کا مدار نیت پر ہے۔ یعنی عمل صالح وہی ہوگا اور اس کی اللہ کے یہاں قدر و قیمت ہوگی جو صالح نیت سے کیا گیا ہو، اور جو عمل صالح "کسی بری غرض اور فاسد نیت سے کیا گیا ہو وہ صالح اور مقبول نہ ہوگا بلکہ نیت کے مطابق فاسد اور مردود ہوگا۔ اگرچہ ظاہر نظر میں "صالح" ہی معلوم ہو۔

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ عمل کے ساتھ نیّت کا اور ظاہر کے ساتھ باطن کا بھی دیکھنے والا ہے۔ اس کے یہاں ہر عمل کی قدر و قیمت عمل کرنے والے کی نیّت کے حساب سے لگائی جائیگی۔

صالحین کے دلوں میں خدا کے دین کا عشق اتنا شدید تھا کہ اس کے مقابلے میں خون و نسب کے رشتے بھی ماند پڑ گئے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن رضؓ جنگ بدر تک ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اس جنگ میں وہ کافروں کی طرف سے ہو کر مسلمانوں کی فوج سے لڑے تھے۔ بعد میں جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو ایک دن اپنے والد ماجد سے کہنے لگے:

" بدر کے روز آپ کئی دفعہ میرے تیر کی زد میں آئے مگر میں نے ہاتھ روک لیا"!

اس پر حضرت صدیق رضؓ نے فرمایا: " اگر تو میرے نشانے میں آجاتا تو میں کبھی نشانہ خطا نہ کرتا"۔

جس طرح باہمی انسانی محبتیں دین کی محبت پر غالب نہیں آسکتی تھیں، اسی طرح باہمی رنجشوں کے معاملے میں بھی حبّ دین ہی کو اوّلیت حاصل رہتی تھی۔ جب بدقسمتی سے حضرت علی رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ کے باہمی تعلقات میں کدورت آگئی تو قیصر روم نے چاہا کہ مسلمانوں کی باہمی رنجش سے فائدہ اٹھائے اور ان پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ جب امیر معاویہ رضؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے قیصر کے نام ایک خط لکھا:

" اگر تم نے اپنا ارادہ پورا کرنے کی ٹھان لی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی (حضرت علی رضؓ) سے صلح کر لوں گا۔ پھر تمہارے خلاف اُن کا جو لشکر روانہ ہوگا، اس کے ہراول دستے میں شامل ہو کر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا دوں گا اور تمہاری حکومت کو گاجر مولی کی طرح اکھاڑ پھینکوں گا"۔ (تاج العروس)

انسان ضعیف البنیان جس کے سر کو پھوڑنے کے لیے ایک معمولی پتھر کافی ہوتا ہے، جب اس کے دل میں کسی مقصد کا عشق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اسی کمزور سر کو لے کر پہاڑوں اور چٹانوں سے ٹکرا جاتا ہے اور انہیں پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے! انسانی تاریخ میں انسان نے جب بھی کسی ہفتخواں کو سر کیا تو اسی طرح کیا کہ اس کے دل میں کسی مقصد کی لگن لگ گئی تھی جو اسے بے انتہا پیاری تھی اور اُس لگن نے اس کی ہر مشکل کو آسان

کر دیا۔ ہماری اپنی تاریخ کے جو کارنامے ناقابل فراموش ہیں، وہ اسی طرح سرانجام پائے تھے۔ کہ مسلمانوں کے دلوں میں خدا، رسولؐ اور دین کی محبت اتنی گہری ہو گئی کہ انہیں کوئی مشکل مشکل نظر نہ آئی۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

یہی وہ عشق ہے جو عقل، دل اور نگاہ تینوں کی رہنمائی کرتا ہے اور انہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے سے بچا کر سیدھی راہ پر لگاتا ہے۔ جن عاشقانِ پاک طینت کے دلوں میں یہ عشق گھر کر گیا انہیں نہ کوئی جسمانی اذیت اپنی راہ سے ہٹا سکی نہ کوئی مالی نقصان، نہ انگشت نمائیاں نہ ملامتیں، نہ کسی اور قسم کی کوئی آزمائش۔ آج بھی اگر ہم اپنا کھویا ہوا وقار اور اپنا منصب امامت دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہماری کوششوں کا نقطۂ آغاز یہی ہونا چاہیے کہ دلوں میں اس دین کے لیے گہری محبت اور جذبۂ فدائیت پیدا کریں، جس نے ہمیں ایک علیحدہ ملت کی شکل دی ہے۔

رہرواں راخستگیٔ راہ نیست
عشق ہمراہ است وہم خود منزل است

(راہ پر چلنے والوں کو کوئی تھکاوٹ دامنگیر نہیں ہوتی کیونکہ عشق ان کا ہمسفر ہے اور وہ خود ہی ان کی منزل بھی ہے)

حضرت سید علی ہجویریؒ فرماتے ہیں :

"جو شخص خدا کے احکام مخلوق کو پہنچانے کا فرض اپنے ذمہ لے، اسے سنّت کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔"

یہ چھوٹا سا قول ہے مگر اپنے اندر معنی کا سمندر رکھتا ہے۔ جس کسی کے دل میں خوش قسمتی سے یہ شوق پیدا ہو جائے کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق کو اُس کے دین سے متعارف کراؤں، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے آگے وہ خدا کے دین کو پیش کرے گا وہ پہلے خود اس کے اپنے اعمال و افعال کو دیکھیں گے کہ جس نظامِ زندگی کو یہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے اس نے خود اس کی اپنی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔ اور اگر وہ دیکھیں گے کہ اس کی اپنی زندگی اُس کی برکات سے خالی ہے تو وہ اس کی زبان سے پہنچائے ہوئے پیغام پر زیادہ بھروسہ نہیں کریں گے۔ ذیل میں ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو بےحد عبرت انگیز ہے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب لاہور میں بکثرت ہندو آباد تھے، ایک مخلوط محلے میں صبح صبح ایک ہندو عورت اپنے دیر تک سوئے رہنے والے بیٹے پر ناراض ہو رہی تھی اور ریکا، پکار کر کہہ رہی تھی: "ارے موہن لال، تیرا ستیاناس! تو بھی مسلمانوں کی طرح دن کے دس بجے تک سویا رہتا ہے"۔

اب اگر اس عورت کو بتایا جاتا کہ مسلمانوں پر تو صبح کی نماز فرض ہے جس کا صحیح وقت طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے، تو اسے کاہے کے لیے یقین کرنا تھا، کیونکہ اس نے اپنے ارد گرد جو کچھ دیکھا تھا وہ تو یہی تھا کہ مسلمان دن چڑھے تک سوئے رہتے تھے۔

مختلف مذاہب پر ایمان رکھنے والوں کی غالب اکثریت ایک دوسرے کے مذاہب

کی مقدس کتابیں کھول کھول کر نہیں پڑھتے بلکہ صرف ان مذاہب پر ایمان رکھنے والے لوگوں کے کردار کو دیکھتے ہیں۔ اگر وہ کردار ناپسندیدہ ہوں تو پھر اُن کے دلوں میں اُن مذاہب کی طرف میلان پیدا ہونے کا بہت کم امکان ہوتا ہے چاہے اُن مذاہب کے بے کردار پیرو انہیں اپنے اپنے مذاہب کی طرف لانے کے لیے کتنے ہی جتن کیوں نہ کریں۔

اگر ہمیں بنی نوع انسان کو اس طرف مائل کرنا ہے کہ آخری نبیؐ کے لائے ہوئے دین کو مانیں تو پھر لازمی ہے کہ ہم خود اپنی زندگیوں کو اُس عالی وقار نبیؐ کی سنت کے مطابق ڈھالنے کی امکان بھر کوشش کرتے رہیں، ورنہ ہماری تبلیغ بالکل بے اثر رہے گی۔

تبلیغِ دین کے لیے خود اپنا کردار درست رکھنا کتنا ضروری ہے، ذیل کی آیات و احادیث اس کی اچھی طرح وضاحت کردیتی ہیں:

سورۃ الصف آیات ۲،۳ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اے ایمان والو، ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں"۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آنے تک بنو اسرائیل کا یہ حال ہو چکا تھا کہ وہ لوگوں کو تو نیکی کی تلقین کرتے تھے مگر اپنی سیرت و کردار کا کچھ دھیان نہیں رکھتے تھے۔ انہیں ملامت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"کیا تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہوئے اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم (خدا کی) کتاب پڑھتے ہو تو کیا عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟" (البقرہ: ۴۴)

"حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے پیغمبر بھی مجھ سے پہلے گزرے ہیں، ان کی امتوں میں ان کے جاں نثار اور ان کے صحابی ہوتے رہے ہیں جو اُن کی سنت کی پیروی اور ان کے احکام کی اقتداء کرتے رہے ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین پیدا ہوئے جو کہتے تھے وہ کچھ جو کرتے نہیں تھے، اور کرتے تھے وہ کام جن کا انہیں حکم نہیں ملا ہوا تھا۔"

اتنا بیان کرکے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن "خود میاں فضیحت دیگراں را نصیحت" قسم

کے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ :

"تو ایسوں سے جس نے ہاتھ کے ساتھ جہاد کیا وہ مومن، جس نے اُن سے زبان سے جہاد کیا وہ مومن اور جس نے اُن سے دل سے جہاد کیا وہ مومن، اس کے نیچے ایمان کا کوئی درجہ رائی کے برابر بھی نہیں ہے۔" (مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان اسی بات کی بڑے خوف انگیز لہجے میں وضاحت کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا :

"قیامت کے دن کسی شخص کو لایا جائے گا اور اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی اور وہ ان کے گرد اس طرح گھومے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے (اس پر) دوزخی جمع ہو کر اُسے کہیں گے کہ اے شخص کیا بات ہے، کیا تو نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے منع نہیں کرتا تھا۔ وہ جواب دے گا، ہاں (میں نیکی کا حکم بھی دیا کرتا تھا اور برائی سے منع بھی کیا کرتا تھا) لیکن لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا۔ (اور) انہیں برائی سے روکتا تھا، لیکن خود برائی کرتا تھا۔" (بخاری، مسلم)

ایک اور روایت میں اسی قسم کا مضمون بیان ہُوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"میں نے معراج کی شب میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے جبریلؑ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جبریلؑ نے کہا یہ آپؐ کی امت کے مقررین ہیں۔ یہ لوگوں کو نیکی اور تقویٰ کی تلقین کرتے تھے اور خود کو بھولے ہوئے تھے۔" (مشکوٰۃ)

جن لوگوں نے اپنے آبائی دینوں کو چھوڑ کر دینِ اسلام کو اختیار کیا تھا، وہ سبھی مسلمانوں کی زبانی تبلیغ ہی سے متاثر ہو کر مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جنہیں مسلمانوں کی سیرت اور کردار نے متاثر کیا تھا۔

۶ھ میں حضورؐ نے قریش مکّہ سے ایک معاہدہ کیا تھا جو تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ ہُوا تو دس سال کے لیے تھا، مگر چند سال بعد ہی قریش مکّہ نے اس کی خلاف ورزی کی جس کے باعث معاہدہ ٹوٹ گیا۔ یہ چند سال جن میں یہ معاہدہ

قائم رہا، ایسے گزرے جن میں مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے علاقوں میں آتے جاتے رہے اور کافروں نے مدینے آکر مسلمانوں کی زندگیوں کو قریب سے دیکھا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ "سیرۃ النبیؐ" جلد اوّل میں صلح حدیبیہ کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے آمدورفت شروع ہوئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینے میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسنِ عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا۔ جو مسلمان مکّے جاتے تھے ان کی صورتیں یہی مناظر پیش کرتی تھیں۔ اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس معاہدہ صلح سے لے کر فتح مکّہ ۸ھ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ پہلے کبھی نہیں لائے تھے۔ حضرت خالدؓ (فاتح شام) اور حضرت عمروؓ بن العاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔"

یہی مضمون مولانا شبلیؒ نے اپنی ایک اور شہرۂ آفاق کتاب "الفاروق" میں بیان کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں اشاعتِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اشاعتِ اسلام کی بڑی تدبیر یہ ہے کہ غیر قوموں کو اسلام کا جو نمونہ دکھایا جائے وہ ایسا ہو کہ خود بخود لوگوں کے دل اسلام کی طرف کھنچ آئیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں نہایت کثرت سے اسلام پھیلا اور اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنی تربیت اور ارشاد سے تمام مسلمانوں کو اسلام کا اصلی نمونہ بنا دیا تھا۔ اسلامی فوجیں جس ملک میں جاتی تھیں، لوگوں کو خواہ مخواہ ان کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ چند بادیہ نشینوں کا دنیا کی تسخیر کو اٹھنا حیرت اور استعجاب سے خالی نہ تھا۔ اس طرح جب لوگوں کو ان کے دیکھنے اور ان سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا تھا تو ایک ایک مسلمان سچائی، سادگی، پاکیزگی، جوش اور اخلاص کی تصویر نظر آتا تھا۔ یہ چیزیں خود بخود لوگوں کے دلوں کو کھینچتی تھیں اور اسلام ان میں گھر کر جاتا تھا۔"

اسی بیان میں آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں:

"شطا جو مصر کی حکومت کا ایک بڑا رئیس تھا، مسلمانوں کے حالات ہی سن کر اسلام کا

گرویدہ ہوا اور آخر دو ہزار آدمیوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔"

شاہ معین الدین احمد ندوی اپنی ایک تالیف میں جو انہوں نے تابعین کے بارے میں لکھی ہے، قاضی شریح کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں :

"ایک دفعہ حضرت علیؓ کی زرہ کہیں گر پڑی اور ایک ذمی کے ہاتھ لگی۔ حضرت علیؓ نے شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا۔ شریح نے ذمی سے پوچھا "تمہارا کیا جواب ہے"؟ اس نے کہا کہ میری ملکیت کا ثبوت یہ ہے کہ زرہ میرے قبضے میں ہے۔ شریح نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کی کوئی شہادت ہے کہ زرہ گم گئی تھی۔ انہوں نے حضرت حسنؓ اور قنبر کو شہادت میں پیش کیا۔ شریح نے کہا "قنبر کی شہادت تو قبول کرتا ہوں لیکن حسنؓ کی شہادت مسترد کرتا ہوں۔" حضرت علیؓ نے فرمایا۔ آپ نے رسولِ خداؐ کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے کہ الحسن والحسین سیدا شُبابِ اهل الجنة (حسنؓ اور حسینؓ اہلِ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے)۔ شریح نے کہا۔ "سنا ہے لیکن میں باپ کے مقابلے میں لڑکے کی شہادت معتبر نہیں سمجھتا۔" اس فیصلے کو حضرت علیؓ نے تسلیم کر لیا اور زرہ یہودی کے پاس رہنے دی۔ اس واقعے کا یہودی پر آنا اثر ہوا کہ اس نے خود اقرار کر لیا کہ زرہ آپ ہی کی ہے اور تمہارا دین سچا ہے۔ مسلمانوں کا قاضی امیر المومنین کے خلاف فیصلہ کرتا ہے اور وہ بلا چون و چرا سر خم کر دیتا ہے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے سچے رسول ہیں ـــ حضرت علیؓ کو اس کے اسلام لانے سے اتنی مسرت ہوئی کہ اس کی یادگار میں انہوں نے زرہ اپنی طرف سے اس کو دے دی۔"

مشہور مورخ علامہ بلاذری حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"انہوں نے بادشاہوں کو اسلام اور اطاعت کی طرف اس شرط پر دعوت دی کہ ان کی بادشاہی میں کوئی خلل نہ آئے گا اور جو حقوق مسلمانوں کے ہیں انہیں ملیں گے اور جو ذمہ داریاں مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں، ان پر عائد ہوں گی۔ چونکہ تمام بادشاہوں کو ان کے کردار کا حال معلوم ہو چکا تھا، اس لیے جلیشہ اور دوسرے بادشاہ اسلام لائے اور اپنے نام عربی رکھے۔"

اس بیان میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دعوتِ اسلام دینے پر جلیشہ اور دوسرے

بادشاہوں کے اسلام لانے کی وجہ جو بتائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے کردار کا حال معلوم ہو چکا تھا۔

مشہور صوفی حضرت بایزید بسطامیؒ کے بارے میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ کے پڑوس میں ایک آتش پرست کا گھر تھا۔ ایک دفعہ وہ سفر پر گیا۔ اس کا ایک شیر خوار بچہ تھا۔ رات ہوتی تو یہ بچہ اندھیرے کی وجہ سے رونے لگتا تھا کیونکہ اس آتش پرست کے گھر میں چراغ نہیں تھا۔ حضرت بایزیدؒ نے اپنا معمول بنا لیا کہ جونہی رات ہوتی وہ اپنے گھر سے چراغ اٹھاتے اور ہمسائے کے گھر میں رکھ آتے۔ اس طرح بچّہ خوش ہو جاتا تھا۔ آتش پرست سفر سے واپس آیا تو اس کی بیوی نے اسے سارا حال سنایا۔ وہ حضرت کے حسنِ اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔

اسلامی تاریخ کا ایک عبرت انگیز واقعہ بتاتا ہے کہ کس طرح سیرت و کردار کی پختگی اغیار پر اثر ڈالتی اور انہیں اسلام کے آگے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے۔

دوسری صدی ہجری کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ سجستان و رخج کے حکمران نے جس کا خاندانی لقب "رتبیل" تھا۔ بنو امیہ کی حکومت کو خراج دینا بند کر دیا۔ اس کے خلاف پیہم چڑھائیاں کی گئیں۔ مگر اس نے اطاعت اختیار نہ کی۔ یزید بن عبدالملک اموی کے عہد میں جب خراج طلب کرنے کے لیے اس کے پاس ایک سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمان سفیروں سے کہا:

"وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوئے ہوتے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ گٹے پڑے رہتے تھے اور کھجوروں کی چپلیں پہنا کرتے تھے۔"

سفیروں نے کہا کہ وہ لوگ تو اب گزر چکے ہیں۔ اس پر رتبیل بولا:

"اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شاندار ہیں مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے۔ تم سے زیادہ طاقتور تھے۔"

تاریخ میں آتا ہے کہ یہ کہہ کر رتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور تقریباً

نصف صدی تک اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

واضح رہے کہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب مسلمانوں کا کردار موجودہ عہد کے مقابلے میں بہت زیادہ مضبوط تھا، تاہم جن لوگوں نے اُن سے بھی بہتر سیرت اور کردار والے لوگ دیکھے ہوئے تھے وہ جس طرح اُن پہلے آنے والوں کے آگے جھک گئے، اس طرح ان بعد میں آنے والوں کے آگے نہ جھکے۔۔۔۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ جس تناسب سے مسلمانوں کا کردار کمزور ہوتا جائے اسی تناسب سے غیر مسلموں کے دلوں سے اُن کا رعب اور احترام کم ہوتا چلا جاتا ہے اور جس تناسب سے غیر مسلموں کے دلوں سے مسلمانوں اور اسلام کا احترام کم ہوگا اُسی تناسب سے اُن کے اسلام کی طرف آنے کی راہیں بھی مسدود ہوتی چلی جائیں گی۔

صبر و استقامت

سورۂ لقمان، آیت ۱۷ میں حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
"اے پیارے بیٹے! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور جو مصیبت بھی تجھ پر پڑے اس پر صبر کر، بے شک یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

مفسر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی تلقین کے ساتھ ہی جو مصائب پر صبر کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے گا۔ اس کی راہ میں تکالیف ضرور آئیں گی چنانچہ اسے صبر اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔

لہٰذا دعوتِ دین کا کام کرنے والوں میں جو مخصوص صفات مطلوب ہیں، ان میں ایک صبر و استقامت بھی ہے کیونکہ تبلیغ کی راہ وہ راہ ہے جس میں قدم قدم پہ کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے اور مالی، جسمانی، ذہنی ہر قسم کی اذیتوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے جس انسان میں صبر و استقامت کا مادہ نہ ہو گا وہ اس راہ پہ زیادہ دور تک نہیں چل سکے گا۔

تبلیغ و ارشاد کی ضرورت ہی اس معاشرے میں پڑتی ہے جس میں بگاڑ عام ہو چکا ہو اور افراد قوم برائیوں کے رسیا ہو چکے ہوں۔ پھر ان سے ان کی برائیاں چھڑانے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ پہلے انہیں بتایا جائے کہ تم میں یہ اور یہ برائیاں ہیں اور انسانی فطرت عموماً اس بات کو سخت ناپسند کرتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم میں فلاں اور فلاں خرابی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی انسان افرادِ معاشرہ کو راہِ راست دکھانے کے لیے اٹھتا ہے تو سوائے تھوڑے سے نیک نفوس کے عام لوگ مصلحین کو اپنا نکتہ چیں اور دشمن سمجھ کر

ان کی مخالفت کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔

داعی کے لیے یہ وقت بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے کہ وہ تو عوام کا بھلا چاہتے ہوئے انہیں برائیوں کے عذاب سے بچانے کے لیے کوشاں ہوتا ہے اور عوام کبھی اس کی نیت پر حملہ کرتے ہیں کبھی اسے "جاہ پرست" اور "اقتدار کا بھوکا" قرار دیتے ہیں، کبھی اسے پاگل، مجنون اور بددین کے القاب سے نوازتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ حتی الامکان اسے مالی اور جسمانی تکالیف کا شکار بھی کرتے ہیں اور جہاں تک ہو سکتا ہے اس کی خیر خواہی کے جواب میں جی بھر کر اس سے بدخواہی کرتے ہیں ۔

اب اگر اس داعی میں صبر و استقامت کا مادہ نہیں تو وہ ان بے انصافیوں اور اذیتوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکے گا اور ہمت ہار جائے گا۔

پھر بگڑے ہوئے معاشرے میں جو طبقہ برسر اقتدار ہوتا ہے اس کا اقتدار عموماً اُس بگڑے ہوئے نظام کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ ہر نئی شے کو شبے اور خدشے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ کہیں نظام کی کوئی تبدیلی اُن کے اقتدار کو ختم نہ کر دے۔ چنانچہ وہ مصلحین کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کے اپنے دل میں یہی خدشہ ہوتا ہے کہ اصلاح کی تحریک ہمارے اقتدار کے لیے خطرناک نہ ثابت ہو، اس لیے وہ مصلحین پر عموماً یہی الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچا رکھا ہے اور پھر اپنی ساری قوتوں سے انہیں اس "گستاخی" کی سزا دینے کی طرف چل پڑتے ہیں۔

جب فرعون نے اپنے جادوگروں کو حضرت موسیٰ ؑ کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اور جادوگر حضرت موسیٰ ؑ کے معجزے کو دیکھ کر سجدے میں گر گئے اور ایمان لے آئے تو فرعون سخت طیش میں آیا اور غضبناک ہو کر بولا :

"کیا تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں۔ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تا کہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کرو"۔ (الاعراف : ۱۲۳)

پھر اُس نے اُن نومسلم جادوگروں کو وہی دھمکی دی جو ایسے فراعنہ دیتے چلے آئے ہیں کہ :

"اچھا، تو اب اس کا نتیجہ تمہیں معلوم ہُوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مقابل سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔" (الاعراف: ۱۲۳، ۱۲۴)

نومسلم جادوگروں نے بڑے صبر و تحمل سے جواب دیا۔" بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب ہمارے رب کی نشانیاں ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انہیں مان لیا۔" (الاعراف: ۱۲۵، ۱۲۶)

پھر وہ اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگتے ہیں، وہ یہی صبر و استقامت اور ایمان کے ساتھ خاتمہ بالخیر ہونے کی دعا ہے۔ وہ خدا کے حضور میں عرض کرتے ہیں :

"اے ہمارے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھانا تو اس حال میں اٹھانا کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں۔" (الاعراف : ۱۲۶)

دعوتِ دین کے سلسلے میں جو تکالیف آتی ہیں اور جن کے مقابلے کے لیے صبر و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف باہر ہی سے نہیں آتیں۔ کبھی خود اپنے نفس کے اندر سے بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ شیطان جو انسان کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے ہر اس موقع کی تاک میں رہتا ہے جس سے وہ داعی الی الحق کے دل میں شکوک و شبہات اور دل شکستگی پیدا کر سکے۔ ایک اصلاحی مہم کا کامیاب ہونا عموماً وقت طلب اور بڑا لمبا کام ہوتا ہے۔ بسا اوقات بار بار ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جسے نفس "شکست" قرار دے کر دل میں یاس اور ناامیدی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بڑی آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر داعی اس نازک موقع پر صبر، حوصلے اور عزم سے کام نہ لے سکے اور اس پر ناامیدی غالب آجائے تو اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہی ہو گا کہ اس کے دل سے اپنے مقصد کی لگن ہی ختم ہونا شروع ہو جائے گی۔ اس مضمون کے متعلق مرزا غالب نے ایک بڑا پُرمعنی شعر کہا ہے ؎

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اس شعر میں اسی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ جب کسی شے کے حصول کے بارے میں دل میں ناامیدی پیدا ہو جائے تو پھر اس شے کی کشش دل سے ختم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

لہٰذا داعی کو صرف باہر کے لوگوں کی ریشہ دوانیوں اور اذیت رسانیوں ہی کے خلاف صبر و تحمل سے کام نہیں لینا ہوتا بلکہ خود اپنے دل کے اندر بیٹھے ہوئے شیطان کے وسوسوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی اسے صبر و استقامت کی بے انتہا ضرورت ہوتی ہے۔

پھر انسان ضعیف البنیان ہے یہ بھی بعید نہیں کہ جب تبلیغ کی راہ میں اسے کچھ دیر مالی، جسمانی اور ذہنی اذیتیں سہنی پڑیں اور کامیابی نظر نہ آئے تو وہ تھک کر اس معزز کام ہی سے علیحدہ ہو جائے یا جب وہ دیکھے کہ اس جیسے دوسرے لوگ کیا مزے سے صرف اپنے اور اپنے بال بچوں اور متعلقین ہی کے متعلق سوچتے ہیں اور ان میں مگن رہتے ہیں اور ان تمام انگشت نمائیوں اور اعتراضات سے بچے ہوئے ہیں جن کا وہ خود شکار ہے تو عجب نہیں کہ نفس کے اندر بیٹھا ہوا شیطان اسے بہکانے لگے کہ جانے دو، تم کس بات کے پیچھے پڑ کر زندگی خراب کر رہے ہو، اور وہ ایک انتہائی زیاں کار انسان کی طرح اس کے بہکانے میں آ جائے اور دعوتِ دین کا کام چھوڑ چھاڑ کر اسی طرح دنیا کمانے میں لگ جائے جیسے وہ لوگ لگے ہیں جنہیں دیکھ کر انہیں رشک آیا تھا۔

یہ سب کچھ عین ممکن ہے۔ لہٰذا خارجی مخالفتیں ہوں یا داخلی، دونوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر و استقامت ناگزیر ہے اور دین کی دعوت دینے والوں میں جب تک صبر و استقامت نہ ہوگا، وہ کسی محاذ پر بھی فتح حاصل نہیں کر سکتے۔

دعوتِ دین کی راہ میں جن تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، وہ مالی بھی ہوتی ہیں جسمانی بھی اور قولی بھی۔ یعنی مخالفین انہیں مالی اور جسمانی نقصانات بھی پہنچاتے ہیں اور زبان طعن سے ان کے سینے بھی زخمی کرتے ہیں۔ سورہ البقرہ آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت آ پڑے تو کہیں کہ "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم کو پلٹ کر جانا ہے"! انہیں خوشخبری دے دو کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی۔ اس کی رحمت

ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔"

ایسے ہی سورہ آلِ عمران، آیت ۱۸۶ میں ارشاد ہوا ہے :

"مسلمانو تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر (ان سب حالات میں) تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔"

انسانوں میں سب سے زیادہ نیک نفس، عالی وقار اور بنی نوع انسان کے ہمدرد انبیاءؑ تھے۔ مگر ان پاک طینتوں نے بھی جب خدا کی مخلوق کو خدا کا پیغام پہنچایا تو ان کی قوموں نے انہیں سخت تنگ کیا مگر انہوں نے صبر و استقلال کا دامن تھامے رکھا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۱۲ میں ان پیغمبروں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی تکلیف دینے والی قوموں کو مخاطب کرکے کہا :

"جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو، ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ ہی پر ہونا چاہیئے۔"

خود رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا :

"مجھے خدا کی راہ میں اتنا اتنا ڈرایا گیا کہ کبھی کوئی انسان اتنا نہیں ڈرایا گیا۔ اور مجھے خدا کی راہ میں اتنی اتنی اذیت دی گئی کہ کبھی کسی آدمی کو اتنی اذیت نہیں دی گئی۔ اور مجھ پر تیس شب و روز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلالؓ کے کھانے کے لیے کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی جاندار کھا سکے۔ سوائے اس مختصر توشے کے جو بلالؓ کی بغل میں تھا۔" (ترمذی)

"مستدرک حاکم" میں بیان ہوا ہے کہ قبیلۂ مراد کا ایک شخص حضرت اویس قرنیؒ کے پاس گیا اور سلام کے بعد پوچھا کہ "اویس تمہارا کیا حال ہے"۔ حضرت اویسؒ نے فرمایا۔ "الحمد للہ"۔ اس شخص نے پوچھا : "زمانے کا تمہارے ساتھ کیا طرزِ عمل ہے؟" حضرت اویسؒ نے جواب دیا۔ "یہ سوال اس شخص سے کرتے ہو جس کو شام کے بعد صبح ملنے کا یقین نہیں اور صبح کو شام ملنے کی امید نہیں۔ میرے مرادی بھائی موت نے کسی شخص کے لیے خوشی کا محل باقی ہی نہیں رکھا۔ مرادی بھائی، خدا کے عرفان نے مومن کے لیے چاندی سونے کی کوئی قیمت باقی

نہیں رکھی ۔مرادی بھائی، خدا کے کاموں میں مومن کے فرض کی ادائیگی نے اُن کا کوئی دوست باقی نہیں چھوڑا ہے۔ خدا کی قسم چونکہ ہم لوگوں کو اچھے کاموں کی تلقین کرتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں، اس لیے انہوں نے ہم کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے اور اس میں ان کو فاسق مددگار مل گئے ہیں جو ہم پر بڑی تہمتیں رکھتے ہیں۔ لیکن خدا کی قسم ان کا یہ ردّیہ مجھے حق بات کہنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔"

چونکہ راہِ حق کے مسافروں کی راہ میں آنے والی اذیتیں بڑی عام اور جاں گسل ہوتی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں بار بار صبر و استقامت کی نصیحت کی ہے۔ صبر و استقامت کی نصیحت کے ساتھ ساتھ انہیں حوصلہ اور تسلّی بھی دی جاتی رہی ہے کہ اس صبر کا انجام شیریں ہوگا۔ سورہ آلِ عمران کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے:

"اے ایمان والو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ پورے کامیاب ہو۔"

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۳ میں فرمایا ہے:

"البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑے اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔"

سورۃ البقرہ، آیت ۱۵۳ میں ارشاد ہوا ہے:

"اے ایمان لانے والو، صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

سورہ یونس، آیت ۶۵ میں رسولِ خداؐ کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا ہے:

"(اے نبیؐ) جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں، بے شک عزّت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

سورۃ النحل، پارہ ۱۴، آیات ۱۲۷، ۱۲۸ میں ارشاد ہوا ہے:

"(اے نبیؐ) صبر کرو اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان (مخالفینِ اسلام) لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چالبازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ اُن لوگوں کے ساتھ

ہے جو پرہیز گاری اختیار کرتے ہیں اور جو نیکوکار ہیں "۔

سورۃ المومن، آیت ۷۷ میں ارشاد ہوا ہے :

"پس (اے نبیؐ) صبر کرو، اللہ کا وعدہ برحق ہے، اب خواہ ہم تمہیں ان بُرے نتائج کا کوئی حصہ دکھا دیں جن سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں یا (اس سے پہلے) تمہیں دنیا سے اٹھا لیں (جو صورت بھی ہو) پلٹ کر آنا تو انہیں ہماری طرف ہی ہے (ہم انہیں اُن کے کیے کا مزہ چکھا دیں گے "۔

سورۃ یٰسین، آیت ۷۶ میں فرمایا ہے :

"پس (اے نبیؐ) ان لوگوں کی باتیں آپؐ کے لیے آزردگی کا باعث نہ ہوں۔ بے شک ہم سب جانتے ہیں جو کچھ یہ دل میں رکھتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں "۔

سورۃ الانعام، آیت ۳۳ اور ۳۴ میں فرمایا گیا ہے :

" (اے نبیؐ) ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن سے تمہیں رنج ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم درحقیقت اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں۔ مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں، انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔"

سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۴ میں ارشاد ہوا ہے :

"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا۔ حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں، اللہ کی مدد قریب (ہی) ہے "۔

مدینے کے یہودیوں کی اوس اور خزرج کے قبیلوں سے دوستیاں چلی آ رہی تھیں۔ اوس اور خزرج اسلام لانے کے بعد بھی ان سے پرانے تعلقات نباہتے رہے مگر یہودی اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن ہو چکے تھے اور طرح طرح کے فتنے پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان

کے بارے میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ ان کی شرارت کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہیں صبر اور تقویٰ سے کام لینا ہوگا۔

سورہ آل عمران، آیت ۱۲۰ میں فرمایا گیا ہے :

"تمہارا بھلا ہوتا ہے تو اُن کو بُرا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہوسکتی، بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔"

حضرت سعدؓ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "یارسول اللہؐ سب سے زیادہ سخت آزمائش کس شخص کی ہوتی ہے۔"

آپ نے فرمایا۔" انبیاء علیہم السلام کی۔ پھر جو دین و ایمان میں اُن سے زیادہ قریب ہو اور پھر جو اس سے قریب ہو۔ آدمی کی آزمائش اس کے دین کے اعتبار سے ہوتی ہے پس جو شخص اپنے دین میں پختہ ہوتا ہے۔ اس کی آزمائش سخت ہوتی ہے اور جو دین میں کمزور ہوتا ہے۔ اس کی آزمائش ہلکی ہوتی ہے اور یہ (مضبوط دین والے کی) آزمائش برابر ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر گناہ کا کوئی اثر نہیں رہ جاتا۔ (مشکوٰۃ)

رسولِ خداؐ نے فرمایا۔ "جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے گا۔ خدا اُس کو صبر بخشے گا اور صبر سے زیادہ بہتر اور بہت سی بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں"۔ (بخاری و مسلم)

صبر کی تاکید، اہمیت اور فضیلت سمجھنے کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ ذہن میں یہ بات صاف کر لی جائے کہ صبر کے مفہوم میں کیا کچھ شامل ہے؟

سورۃ الفرقان، آیت ۷۲ تا ۷۶ میں ارشاد ہوا ہے :

"(اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے اور کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں، جنہیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔ جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا"۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر کا پھل منزل بلند کی شکل میں پائیں گے۔

آداب وتسلیمات سے ان کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام"۔

تفہیم القرآن جلد سوم، صفحہ ۴۷۱ پر اس آیت میں آنے والے لفظ "صبر" کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔

"صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی دشمنانِ حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ دینِ حق کو قائم کرنے اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہہ جانا، ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہ راست پر ثابت قدم رہنا، شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے علی الرغم فرض کو بجا لانا، حرام سے پرہیز کرنا اور حدود اللہ پر قائم رہنا، گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی اور راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا۔ غرض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رویے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا کی دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے"۔

یہ سطور واضح کر رہی ہیں کہ صبر یہ نہیں کہ انسان اپنے آپ کو حوادثاتِ زمانہ پر چھوڑ دے اور جدوجہد نہ کرے بلکہ صبر یہ ہے کہ انتہائی جدوجہد کرتا رہے مگر نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ قرآن پر غور کرنے سے صبر کا جو مفہوم متعین ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ بندۂ مومن چاہے کسی حالت میں ہو دین کے تقاضے پورے کرتا رہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے زمانے میں مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں وقت کے خلیفہ اور امام صاحبؒ کے درمیان شدید اختلاف ہو گیا۔ اس پر خلیفہ کی طرف سے آپ کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ کتابوں میں اس سزا کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ اگر ہاتھی کو بھی اتنے کوڑے مارے جاتے تو وہ چیخ اٹھتا۔ اس انتہائی اذیت ناک سزا کو آپ نے انتہائی صبر کے ساتھ برداشت کیا اور اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔

جب یہ ظلم وستم بے کار ثابت ہوا تو پھر خلیفہ نے انعام و اکرام کی بارش کر کے انہیں اپنا ہم خیال بنانا چاہا۔ مگر اس کا یہ حربہ بھی ناکام رہا۔ امام صاحبؒ جس طرح ظلم کے مقابلے

میں صابر ثابت ہوئے تھے، اُسی طرح ان ترغیبات کے مقابلے میں بھی صابر ہی ثابت ہوئے۔ ان کے سیرت نگار نے لکھا ہے کہ جب خلیفہ نے انعام و اکرام شروع کیا تو امام صاحب چیخ اٹھے: "خدا کی قسم یہ انعام و اکرام تو مجھ پر کوڑوں سے بھی زیادہ سخت ہیں"۔

کسی بالغ نظر مصنف نے دعوتِ دین اور داعی کے باہمی تعلق کو اس تعلق سے تشبیہ دی ہے جو کسان اور اس کے کھیت کے درمیان ہوتا ہے۔ کس طرح وہ دانہ بونے سے لے کر کھیت کاٹ کر محفوظ کر لینے تک مسلسل اور متواتر مشقت کرتا رہتا ہے اور ہوشیار و چوکنا رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے کسی سٹیج پر بھی غفلت برتی تو میری فصل برباد ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ جب فصل پوری پک چکی ہوتی ہے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ہوشیاری کا ثبوت دیتا ہے کہ کہیں کوئی دشمن آکر اسے آگ نہ لگا دے یا جانور آکر اسے برباد نہ کر جائیں جب تک اس کی فصل کٹ کٹا کر اس کے کھلیانوں میں محفوظ نہیں ہو جاتی اسے چین نہیں آتا۔

دینِ حق بھی اپنے داعیوں سے اسی قسم کی مسلسل اور متواتر صبر و استقامت کا طلبگار ہے۔ تبلیغِ دین کے دوران میں نتائج نکلتے نظر آئیں یا نہ آئیں اور فتح ہو رہی ہو یا شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو۔ صبر و استقامت کی ضرورت ہر حالت میں موجود رہتی ہے۔ شکست کے وقت صبر یہ ہے کہ انسان دل شکستگی سے بچے اور نا امید ہو کر کہیں بے عمل ہی نہ ہو جائے اور فتح کے وقت صبر یہ ہے کہ اپنی کامیابیوں پر پھول کر فخر کا شکار نہ ہو اور عوام میں ہر دلعزیزی اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد اپنے مقصد ہی کو نہ بھلا بیٹھے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مقولہ ہے:

"وہ ضعیف ترین ہے جو اپنی بات پر قائم نہ رہے"۔

مشہور دینی تحریک "الاخوان المسلمون" کے بانی جناب حسن البنا شہیدؒ فرماتے ہیں:

"ثبات و استقلال سے میری مراد یہ ہے کہ ہر اخوانی اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سرگرمِ عمل رہے، خواہ مدتِ عمل کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے۔ اس میں سالہا سال ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ یہ کام ہر اخوانی کو اُس وقت تک جاری رکھنا ہوگا جب تک وہ اپنے رب سے نہیں جا ملتا۔ اس وقت وہ دو کامیابیوں میں سے ایک ضرور حاصل کرے گا یعنی یا تو مقصد

کو پالے گا یا مقصد کی راہ میں شہید ہو جائے گا - قرآن میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے، ان میں سے کچھ تو اپنی منزل کو پہنچ گئے ہیں اور باقی انتظار میں ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے روّیے میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی نہیں کی۔"

یہ بیان کر کے جناب حسن البناء شہیدؒ اپنے ساتھیوں کو صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا، راستہ بہت لمبا اور منزلِ مقصود بہت دور ہے۔ راستہ تباہ کن گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اب صرف استقلال ہی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت بڑا اجر اور بہترین ثواب بھی ملے گا۔"

اگر ہم واقعاتِ عالم پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت غیر اسلامی اور الحادی نظریات کو پھیلانے والے کس تندہی اور صبر و استقلال سے اپنے مضر انسانیت نظریات کو پھیلانے میں جٹے ہوئے ہیں۔ تو پھر حیف ہے اگر مسلمان اپنے بدرجہا زیادہ ارفع اور مفید انسانیت نظریات کو پھیلانے کے سلسلے میں آزمائشوں کے آگے ہتھیار ڈال دے اور بے صبری کا ثبوت دے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ابو الہیثم نامی چور کے لیے اکثر دعائے خیر فرماتے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایک چور کے لیے دعائے خیر کیوں فرماتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے ابتلا کے زمانے میں اس نے اپنے عملی نمونے سے مجھے بڑا قیمتی درس دیا تھا۔ جب مجھے بیڑیوں میں جکڑ کر اور اونٹ پر سوار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو یہ شخص ایک جگہ راہ میں مجھے ملا اور اس نے مجھ سے کہا "ابن حنبلؒ، چوری کے جرم میں مجھے اتنی بار قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں اور اتنے سو درّے میری پیٹھ پر برسے ہیں تاہم میں اپنی اس حرکت سے باز نہیں آیا۔ اگر میں شیطان کی راہ میں یہ مصائب جھیل کر اس طرح استوار رہ سکتا ہوں تو حیف ہے اگر تم خدا کی راہ میں ان مصائب کو

پامردی سے برداشت نہ کرسکو:۔

مومن کے لیے یہ پامردی ایک لازمی امر ہے جس سے ہٹ جانا اس کے لیے عار کی حیثیت رکھتا ہے۔ دعوتِ دین کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی ایک ہی راہ نہیں رکھی بے شمار راہوں سے اس منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ تبلیغ کے لیے جو راہ آپ نے اختیار کی ہو اگر وہ واقعی بند ہی کردی جائے تو آپ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے طریقے سے تبلیغ شروع کر دیں۔ اگر اس دوسرے طریقے سے بھی کام کرنا ممکن نہ رہے تو کوئی تیسرا طریقہ اختیار کرلیں۔ اگر اس تیسرے طریقے پر چلنا بھی محال ہو جائے تو کوئی چوتھی راہ ڈھونڈ نکالیں۔ اگر وہ چوتھی بھی مسدود کردی جائے تو کسی پانچویں کو اختیار کرلیں۔ مگر ہار کبھی نہ مانیں کہ ہار ماننا مومن کا شیوہ نہیں۔

زندگی ایک مختصر سا وقفہ ہے! بہت ہی مختصر! اس مختصر سے وقفے کو اگر کانٹوں پر بھی کاٹ لیں گے تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ کیونکہ اس کو ہماری توقع سے بہت پہلے ختم ہو جانا ہے۔ اور اس کا انجام؟ ــــ وہ تو دائمی اور ابدی ہے۔!

خوش نصیب ہے وہ بندہ کہ جب اس کی موت آئے تو اسے اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف و منہمک پائے ــــ اس وقت اس کا آنا اس جانے والے کے لیے کتنا خوش آئند ہوگا اور کس طرح اس کا دل مسرت سے پکار اٹھے گا۔

"لو! یہ مشقت کا دن تو بیت ہی گیا! ــــ بس اتنی ہی سی تو بات تھی!!!"

خوئے دلنوازی

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی (اقبالؒ)

یہ "خوئے دلنوازی" کیا ہے کہ جب امیرِ کارواں میں یہ موجود نہیں ہوتی تو کچھ لوگ تو اُس کا ساتھ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور کچھ اُور راہ منزل ہی سے بدگمان ہو جاتے ہیں جس کی طرف وہ امیر انہیں لے جا رہا ہوتا ہے۔

خدا کے کلام، نبی پاکؐ کی احادیث اور سلف صالحین کے اقوال و اعمال سے اس "خوئے دلنوازی" کی تشریح کے سلسلے میں بہت کچھ مواد ملتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ راہِ حق کی طرف دعوت دینے والے کا مزاج و اخلاق ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اپنی نرم مزاجی و خوش خلقی، تہذیب و شائستگی، حلم و عفو، شفقت و مہربانی اور محبت و ہمدردی سے دوسروں کے دلوں کو جیت سکے تاکہ لوگ اس کی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کو وقعت دیں۔ حق کی طرف بلانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زبان شیریں، رویہ ہمدردانہ اور گفتگو شفیقانہ ہو۔ وہ لوگوں کی زیادتیوں پر صبر کر کے تیوریوں کے جواب میں مسکراہٹیں دے سکتے ہوں۔ ان کا کام نفرت انگیز مضامین سے پاک ہو۔ وہ کسی فرد یا جماعت کو نام لے کر بُرا نہ کہتے ہوں۔ اُن کی گفتگو میں تعریضیں اور طعن و تشنیع نہ ہو۔ ان کا پیرایۂ گفتگو توہین آمیز نہ ہو، ان میں اتنی دانشمندی، وسعتِ نگاہ اور وسعتِ قلب موجود ہو کہ دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ سکیں اور ان کی مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھ سکیں۔ وہ لوگوں کو بُرا بھلا کہنے یا انہیں ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچانے سے بہت دُور ہوں، وہ بنی نوعِ انسان کے لیے عموماً اور توحید کے علمبرداروں کے لیے خصوصاً شفیق و مہربان ہوں اور اپنے اخلاقِ پسندیدہ کے ذریعے لوگوں سے تعلقات اور میل ملاپ قائم رکھیں

تاکہ انہیں بات کہنے کا اور ان کی بات کو سننے والوں کے دلوں میں راہ پانے کا موقع ملتا رہے۔

سورۂ آل عمران، آیت ۱۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۚ

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے ہیں ورنہ اگر کہیں آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپؐ کے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

اس آیت میں ایک تو حضورؐ کے نرم مزاج ہونے کو امت کے لیے خدا کی ایک رحمت قرار دیا گیا ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ حق کی طرف دعوت دینے والا اگر سخت مزاج اور سخت دل ہو گا تو لوگ اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

اس آیت پاک کی روشنی میں غور کریں تو پھر یہ سمجھنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے کہ بعض "دینداروں" نے سخت مزاجی، سخت کلامی، سخت گیری اور بحث بازی کو دین کے تقاضے کیوں بنا لیا ہے۔ اُن کا یہ رویّہ بے شمار لوگوں کو دین کی طرف لانے کے بجائے انہیں اس سے دور بھگانے کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ جس چیز کی طرف سختی اور کرختگی سے بلایا جائے گا، لوگ اس میں بہت کم کشش محسوس کریں گے۔ جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی دین کی دعوت دینے والوں نے "فَظًّا" "غَلِيْظَ الْقَلْبِ" بننے کی کوشش کی، نتیجہ یہی ہوا کہ کوئی کارواں سے ٹوٹ گیا اور کوئی حرم ہی سے بدگمان ہو بیٹھا۔

جو لوگ دین کے نمائندوں کی حیثیت سے سختی اور کرختگی اختیار کرتے ہیں وہ لوگوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ دین شاید سختی اور کرختگی ہی سکھاتا ہے۔ حالانکہ دین جو کچھ سکھاتا ہے وہ اوپر کی آیت پاک اور ذیل کی عبارات سے بالکل واضح ہے۔

سورہ طٰہٰ، آیات ۴۲، ۴۳، ۴۴ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"تم اور تمہارا بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت چل نکلا ہے، پھر اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔"

سورہ الانعام، آیت ۱۰۸ میں ارشاد ہوا ہے :

"اور (اے ایمان والو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ ہم نے تو اسی طرح ہر گروہ کے لیے اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر انہیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے، اس وقت وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔"

سورۂ لقمان، آیت ۱۸ میں حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"اور لوگوں سے بے رُخی مت کر۔۔۔۔"

سورۂ القلم، آیت ۴ میں اللہ تعالیٰ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف فرماتے ہوئے کہتے ہیں :

"اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو"۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" اے مسلمانو، تم میں سب سے اچھے وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں اور جو تواضع اور فروتنی سے جھکے جاتے ہیں اور تم میں سب سے بُرے وہ لوگ ہیں جو بدزبان اور بدگو اور دریدہ دہن ہوں۔"

(البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میزان میں جو چیز سب سے زیادہ بھاری ہوگی، وہ حسنِ اخلاق ہے۔" (ترمذی)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خدا نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر جو ثواب عطا کرتا ہے وہ سختی پر عطا نہیں کرتا۔ اور نہ نرمی کے سوا کسی اور شے پر عطا کرتا ہے۔" (مسلم)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "اللہ تعالیٰ

نرمی فرمانے والا ہے اور تمام امور میں نرمی کو پسند فرماتا ہے۔" (بخاری)

حضرت ابوذرؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو، اور گناہ کے بعد نیکی کر لیا کرو، وہ اسے مٹا دیتی ہے اور لوگوں کے ساتھ اچھے خلق سے پیش آیا کرو۔" (ترمذی)

ایک فتح کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو لکھا کہ "فارسیوں اور ان قوموں کی جو فارسی حکومت کی رعایا ہوں، تالیف قلب کرو تاکہ وہ اسلام لے آئیں اور اس کے خیر خواہ ہو جائیں۔"

سید اسمٰعیل شہیدؒ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ اپنے ایک گہرے دوست مولوی رستم علی کے ساتھ چاندنی چوک میں سے گزر رہے تھے کہ ایک پہلوان نے سید صاحب کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس پر مولوی رستم علی صاحب کو غصہ آگیا اور تلوار نکال کر اسے مارنے دوڑے۔ سید صاحب نے جھپٹ کر مولوی رستم علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ میاں رستم علی کیا کرتے ہو، وہ گالیاں بے جا نہیں دیتا بلکہ وہ ٹھیک کہتا ہے کیونکہ وہ یہی کہتا ہے کہ یہ بڑا بددین ہے جو نئی نئی باتیں نکالتا ہے، سو اس میں وہ کیا بے جا کہتا ہے۔ میری باتیں اس کے لیے تو واقعی نئی ہیں۔ علماء نے یہ باتیں ان بے چاروں کو کہاں سنائی ہیں، پھر اس کو نئی کیوں نہ معلوم ہوں اور وہ گالیاں کیوں نہ دے۔"

سیّد شہیدؒ کی اس بات کا اس پہلوان پر یہ اثر ہوا کہ اس دن سے آپ کا دوست بن گیا۔ (روایات الطیب)

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاسؒ نے اپنے کارکنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:
"ہماری تحریک اور اسلامی تبلیغ نہ کسی کی دل آزاری کو پسند کرتی ہے اور نہ کسی فتنہ و فساد کے الفاظ سننا چاہتی ہے۔ آپ لوگوں نے بعض جگہ کے لوگوں کو "بدعتی" کے لفظ سے یاد کیا ہے آئندہ سے ایسے الفاظ سے احتراز چاہیے جو اشتعال انگیز اور فتنہ خیز ہوں بلکہ اس قسم کے مبہم الفاظ لکھنے چاہئیں جن سے کسی خاص فرقے یا جماعت پر طعن نہ ہو۔ بہر کیف تحریر و تقریر میں نہ ایسے الفاظ نکلیں جن سے فساد کا اندیشہ و خطرہ ہو اور نہ ایسے خیالات کا اظہار ہو جن سے بدگمانی اور بدظنی بڑھے

سارے مسلمان اپنے ہی بھائی ہیں۔ جب نرمی اور طریقے سے لایا جائے گا تو خود ہی حق پر آ جائیں گے۔"

راہِ حق کی طرف بلانے والوں کو ان آیاتِ الٰہی، احادیثِ نبویہ اور سلف صالحین کے اقوال و اعمال کی روشنی میں اپنا رویہ معین کرنا چاہیے۔ لوگوں کے دلوں میں کوئی بات نقش کرنے سے پہلے انہیں وہ بات سننے پر آمادہ کرنا پڑتا ہے اور جس شخص کو یقین ہو گا کہ آپ اس کے حقیقی خیر خواہ اور چاہنے والے ہیں، وہ آپ کی بات سننے کے لیے زیادہ جلدی تیار ہو گا بہ نسبت اس شخص کے جس کی نگاہ میں آپ کی حیثیت ایک سخت مزاج، نکتہ چیں سے زیادہ نہ ہو۔ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت انسانی نرمی، ہمدردی اور محبت سے لازماً متاثر ہوتی ہے۔

داعی کے لیے حق گوئی ایک بہت بڑا وصف ہے مگر حق بات کہتے ہوئے یہ تو ضروری نہیں کہ اسے کہنے کے لیے لہجہ اور الفاظ ایسے استعمال کیے جائیں جو سننے والے کے سینے سے پار ہو جائیں۔ دنیا میں سب سے بڑے حق گو انبیائے کرامؑ تھے مگر ان پاکبازوں نے تو اپنی انتہائی شریر، بدکردار اور تنگ کرنے والی قوموں کو بھی "اے میری قوم" کہہ کہہ ہی مخاطب کیا اور ان کی شرارتوں کا جواب خیر خواہی اور دعاؤں ہی سے دیا۔

دعوتِ دین صرف زبان ہی سے نہیں دی جاتی بلکہ اپنے اعمال و افعال، محبت و ہمدردی اور حسنِ سلوک سے بھی دی جاتی ہے۔ اگر ہم حسنِ سلوک اور مہر و محبت ہی کی بساط تہہ کر کے رکھ دیں گے تو ہمارے خشک وعظ سے کون متاثر ہو گا — خوئے دلنوازی اس وقت بھی بیحد ضروری ہے جب معاملہ غیر مسلموں کو دعوتِ دین دینے کا ہو۔ کجا یہ کہ خود مسلمانوں کی اصلاح کرتے وقت سخت گیری، حقارت اور درشتی سے کام لیا جائے۔

سورۃ الشعراء، آیات ۲۱۴، ۲۱۵ میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"(اے نبیؐ) اپنے قریب ترین رشتے داروں کو ڈراؤ اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔"

حضرت براء بن عازبؓ صحابی کے پاس ایک دفعہ ابوداؤد آئے۔ حضرت براءؓ نے

خود انہیں سلام کیا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خوب ہنسے۔ پھر فرمایا: "جانتے ہو میں نے ایسا کیوں کیا؟ حضورؐ نے میرے ساتھ ایک دفعہ ایسے ہی کیا تھا اور فرمایا تھا کہ جب دو مسلمان آپس میں ایسے ملیں اور کوئی ذاتی غرض درمیان میں نہ ہو تو دونوں کی مغفرت کی جاتی ہے۔" (مسند)

حضرت جریر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "جو نرمی سے محروم رہا وہ تمام بھلائی سے محروم رہا۔" (مسلم)

مسلمانوں کے شیریں زبانی اور پختہ کرداری سے عاری ہو جانے کا افسوس کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

اے لاالٰہ کے وارث، باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ

دعوتِ دین دینے والوں کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اُن کے لیے اصل نمونہ رسول خداؐ کا کردار ہے۔ کیا آپ لوگوں کو دین سکھاتے وقت سخت مزاجی اور سخت گیری کا ثبوت دیتے تھے؟ یا انہیں چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں پر سب کے سامنے برملا ٹوکتے تھے؟ یا ایسا رویہ اختیار کرتے تھے جس سے اپنی برتری اور دوسرے کی کمتری کا اظہار ہوتا ہو؟ یا آپ نرم خو، نرم مزاج، شفیق اور مہربان تھے؟

حضرت مالک بن حویرثؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ہم کچھ ہم عمر نوجوان رسولِ خداؐ کی خدمت میں سیکھنے کے لیے پہنچے اور ہم آپؐ کی خدمت میں بیس راتوں تک رہے۔ واقعی خدا کے رسولؐ انتہائی رحیم اور نرم دل تھے۔ جب آپؐ نے محسوس کیا کہ اب ہمیں گھر والوں کی یاد ستا رہی ہے تو ہم سے پوچھنے لگے کہ تم لوگ اپنے پیچھے گھر میں کن کن لوگوں کو چھوڑ کر آئے ہو۔ ہم نے تفصیل بتائی تو فرمایا کہ اچھا تو اب تم لوگ اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ اور انہیں کے ساتھ رہو۔ اور (جو کچھ تم نے سیکھا ہے) انہیں سکھاؤ اور انہیں نیک باتوں کی تلقین کرو اور جب نماز کا وقت آ جائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان دے اور جو تم میں سب سے بڑا ہو وہ تمہارا امام بنے۔" (مسلم)

صحیح بخاری میں حضرت براءؓ سے ایک روایت ہے کہ ۶ھ ذلیقعدہ میں جب حضورؐ عمرہ کرنے مکّے کی طرف گئے تو کفار نے اندر نہ آنے دیا۔ پھر مسلمانوں اور کفار کے درمیان ایک معاہدہ ہُوا جس کی رو سے مسلمان آئندہ سال مکّے میں آسکتے تھے۔ مگر صرف تین دن ہی قیام کر سکتے تھے۔ چنانچہ آئندہ سال حضورؐ مکّے گئے اور جب وہ معینہ مدت گزر گئی تو لوگ حضرت علیؓ کے پاس پہنچے کہ اب اپنے ساتھی سے کہیں کہ وہ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ معینہ مدت گزر گئی ہے۔ چنانچہ حضورؐ وہاں سے روانہ ہوئے۔ جب حضورؐ وہاں سے چلے تو حضرت حمزہؓ کی بیٹی چچا چچا کہتی آپؐ کے پیچھے ہولی۔ حضرت علیؓ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت فاطمہؓ کو دیتے ہوئے کہا:

"اپنے چچا کی بیٹی کو لے لو۔"

حضرت فاطمہؓ نے اسے سوار کر لیا۔ اب حضرت علیؓ حضرت جعفرؓ اور حضرت زیدؓ کے درمیان اس لڑکی کے باعث جھگڑا ہونے لگا۔ حضرت علیؓ کہتے تھے کہ میں اس لڑکی کا حقدار ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت جعفرؓ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ اور اس کی خالہ میری بیوی ہے۔ حضرت زیدؓ یہ کہہ کر اپنا حق ثابت کرتے تھے کہ یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔

ان لوگوں کے باہمی اختلاف کو دیکھ کر حضورؐ نے ان کے درمیان فیصلہ چکاتے ہوئے لڑکی کی خالہ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور فرمایا:

"خالہ بمنزلہ ماں کے ہے۔"

پھر آپؐ نے حضرت علیؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔"

اور حضرت جعفرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"تم صورت و سیرت میں مجھ سے زیادہ مشابہ ہو۔"

اور حضرت زیدؓ کو تسلّی دی کہ:

"تو ہمارا بھائی ہے اور ہمارا مولا ہے ۔"

اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ تو اسی کے حق میں دیا جسے زیادہ مستحق سمجھا۔ مگر اپنی شیریں گفتاری سے سب کو اپنی اپنی جگہ مطمئن کر دیا۔

حضرت معاویہ بن الحکم سلمی رضؓ بیان کرتے ہیں کہ اس دوران میں کہ میں رسولِ خداؐ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا، اچانک نمازیوں میں سے ایک شخص کو چھینک آگئی۔ میں نے یرحمک اللہ (اللہ تجھ پر رحم کرے) کہہ کر اس کا جواب دیا، تو نمازی مجھ کو گھورنے لگے۔ میں نے کہا "تم اپنی ماؤں کو گم کرو، مجھ کو کیوں گھور رہے ہو۔" تو وہ یہ سن کر اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارنے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش ہی کرنا چاہتے ہیں (تو مجھے خوب غصہ آیا) لیکن میں خاموش ہو گیا۔ جب رسولِ خداؐ نماز سے فارغ ہوئے، میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، میں نے آپؐ سے پہلے اور آپؐ کے بعد کوئی آپؐ سے زیادہ اچھی طرح تعلیم دینے والا معلّم نہیں دیکھا، پس خدا کی قسم نہ آپؐ نے مجھے ڈانٹا اور نہ مارا اور نہ برا بھلا کہا (بلکہ) فرمایا کہ نماز میں انسانی کلام میں سے کچھ (زبان پر لانا) درست نہیں ہے۔ نماز تو اللہ کی پاکی بیان کرنے، اس کی بڑائی بیان کرنے اور قرآن پڑھنے کا نام ہے۔ (مسلم)

حضرت عائشہ رضؓ رسولِ خداؐ کے اخلاق کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

"آنحضرتؐ کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہیں تھی۔ برائی کے بدلے میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ درگذر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ آپؐ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپؐ نے کبھی کسی غلام کو، کنیز کو، کسی عورت کو، خادم کو، جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپؐ نے کبھی کسی کی کوئی درخواست ردّ نہیں فرمائی، سوائے اس کے کہ وہ ناجائز ہو۔ آپؐ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں، ہنستے اور مسکراتے ہوئے۔"

حضرت ہند بن ابی ہالہ رضؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

"آپؐ نرم خو تھے سخت مزاج نہ تھے۔کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو بُرا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آجاتا تناول فرما لیتے اور اس کو بُرا نہ کہتے۔ کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپؐ کو غصہ آجاتا اور اس کی پوری حمایت کرتے لیکن خود اپنے ذاتی معاملے پر آپؐ کو کبھی غصّہ نہیں آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا۔"
(شمائل ترمذی)

ایک دفعہ امام حسینؓ نے حضرت علیؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا تو حضرت علیؓ نے آپؐ کا اخلاق بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"آپؐ خندہ جبیں، نرم خُو، مہربان طبع تھے۔سخت مزاج اور تنگدل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے۔ کوئی بُرا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے۔عیب جو اور سخت گیر نہ تھے۔ کوئی ایسی بات ہوتی جو آپؐ کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے۔ کوئی آپؐ سے کچھ امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس بناتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے۔اپنے نفس سے تین چیزیں آپؐ نے بالکل دُور کر دی تھیں۔بحث مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا۔جب آپؐ کلام کرتے صحابہؓ اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔جب آپؐ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے۔ کوئی دوسرا بات کرتا، تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے آپؐ بھی مسکرا دیتے۔جن پر لوگ تعجب کرتے آپؐ بھی کرتے۔ کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپؐ تحمل فرماتے ۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں فرماتے تھے لیکن اگر کوئی آپؐ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے ۔جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا، آپؐ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔

اگر کوئی دفعتاً آپؐ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔"
(شمائل ترمذی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قریبی ساتھیوں نے حضورؐ کی جو تصویر کھینچی ہے ایک داعی کے لیے وہ اصل نمونہ ہے جس کی پیروی اس کے لیے دعوتِ دین کی راہ میں مددگار ہو سکتی ہے۔

نرم خوئی اور خوش خلقی تبلیغ کی راہ میں کتنی مفید ثابت ہوتی ہے۔ سید اسمٰعیل شہیدؒ کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ اس کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کرتا ہے۔

حاجی امیر شاہ خاں صاحب بیان کرتے ہیں کہ ان سے مرزا ثریا جاہ نے بیان کیا کہ اکبر شاہ، شاہِ دہلی کی بہن تھیں جنہیں "بی چھکو" کہتے تھے۔ یہ اکبر شاہ سے بہت بڑی تھیں، اور انہوں نے اکبر شاہ کو گود میں کھلایا تھا۔ اس لیے بادشاہ بھی ان کا ادب کرتے تھے اور تمام شہزادے اور شہزادیاں بھی ان کو بڑا مانتے تھے۔ غرض تمام اہلِ قلعہ ان سے دبتے تھے۔ وہ کوسنے اور گالیاں بہت دیتی تھیں۔

ایک دفعہ چند شہزادوں اور چند شہدوں نے مشورہ کیا کہ ایک دن بھرے مجمع میں "بی چھکو" سے مولوی اسمٰعیلؒ کو گالیاں دلوانی چاہئیں اور اس کے لیے تدبیر یہ کی گئی کہ اُن شہزادوں نے ایک دعوتی جلسہ تجویز کیا جس میں بی چھکو کو بھی مدعو کیا اور مولانا شہیدؒ کو بھی، اور جو شہزادے شہدے اپنے ہم مذاق تھے، ان کو بھی دعوت دی گئی اور جو شہزادے وغیرہ ان کے ہم مذاق نہ تھے اُن کو مدعو نہیں کیا گیا۔ اور اس عرصے میں یہ کارروائی کی گئی کہ مولانا شہیدؒ کی طرف سے بی چھکو کو خوب بھر دیا گیا کہ اسمٰعیل بی بی کی صحنک کو منع کرتا ہے اور میراں کے بکرے کو ناجائز کہتا ہے، فلاں کے روٹ کو منع کرتا ہے فلاں کے توشے کو، شیخ عبدالقادرؒ کی گیارہویں کو منع کرتا ہے اور یہ کرتا ہے اور وہ کرتا ہے۔

جب خوب بی چھکو کے کان بھر دیئے تو جلسہ منعقد کیا گیا۔ سب لوگ جلسے میں آئے اور بی چھکو بھی آئیں (اور پسِ پردہ بیٹھیں) اتفاق سے سید اسمٰعیل شہیدؒ کو ذرا دیر ہوگئی۔ اس پر اوروں کو موقع ملا اور انہوں نے بی چھکو سے کہا کہ دیکھیے یہ شخص کتنا مغرور ہے کہ اب تک نہیں

آیا۔ اس پر وہ اور بھی زیادہ برہم ہو گئیں ۔

غرض جب مولانا شہید رح جلسے میں پہنچے اس وقت تک لوگ بی چھکو کو خوب گرم کر چکے تھے۔ اُن کے پہنچنے پر بی چھکو نے غصے کی آواز سے پوچھا کہ عبدالعزیز کا بھتیجا اسمٰعیل رح آگیا۔ مولانا جلسے کا رنگ دیکھ کر تاڑ گئے تھے کہ آج ضرور کوئی شرارت کی گئی ہے۔ آپ نے اس کا تو کوئی جواب نہ دیا اور فرمایا۔" اخاہ! یہ آواز تو چھکو اماں کی معلوم ہوتی ہے، اماں سلام "۔

جب انہوں نے ...... اس انداز سے گفتگو کی تو بی چھکو کا غصہ سب کافور ہو گیا اور انہوں نے بڑوں کے قاعدے سے اُن کے سلام کا جواب دیا اور اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے کہا :

" اسمٰعیل رح ہم نے سنا ہے کہ تم بی بی کی صحنک کو منع کرتے ہو "۔

مولانا شہید رح نے فرمایا۔" اماں میں منع نہیں کرتا۔ بھلا میری کیا مجال ہے کہ میں بی بی کی صحنک سے منع کروں۔"

بی چھکو نے کہا:" لوگ کہتے ہیں ۔"

مولانا نے فرمایا۔" جو کوئی کہتا ہے غلط کہتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بی بی کے ابا جان صلعم منع کرتے ہیں، میں لوگوں کو بی بی کے ابا جان صلعم کا حکم سناتا ہوں۔"

اس پر بی چھکو نے حیرت کے لہجے میں فرمایا:" بی بی کے ابا جان منع کرتے ہیں؟ "

مولانا نے فرمایا:" جی ہاں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں ـــــ مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز پیدا کی جو اس کی نہیں تھی تو وہ (چیز) مردود ہے) ۔

مولانا نے یہ حدیث پڑھ کر اس کی تفصیل فرمائی اور اس سے صحنک کی ممانعت ثابت کی۔ بی چھکو نے جو یہ تقریر سنی تو مان گئیں اور کہا کہ :

" اب اگر کوئی عورت ایسا کرے گی تو اس کی ناک چٹیا کاٹ لوں گی۔ ہم بی بی پر ایمان نہیں لائے ہم تو بی بی کے ابا جان پر ایمان لائے ہیں۔ جب وہی منع کرتے ہیں تو پھر ہم کیوں کریں "۔

(روایات الطیب)

خوش خلقی، خندہ روئی اور دوسروں کی مدارات و دلجوئی کرنے کے سلسلے میں بزرگوں کے کئی اقوال روایت کیے گئے ہیں ۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حسنِ اخلاق کی تعریف تین باتوں سے فرمائی ہے ۔

۱۔ جب آدمی کسی سے ملے تو ہنستے مسکراتے چہرے سے ملے ۔

۲۔ خدا کے محتاج اور ضرورت مند بندوں پر خرچ کرے ۔

۳۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے ۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی اللہ تعالیٰ اسے دوست رکھے گا ۔

۱۔ سخاوت دریا کی فیاضی کی مانند کہ جس کا جی چاہے اس سے پانی پی لے ۔

۲۔ شفقت آفتاب کی شفقت کی مانند کہ ہر جگہ یکساں روشنی دیتا ہے ۔

۳۔ تواضع زمین کی تواضع کی مانند کہ اس پر اچھا بُرا ہر قسم کا انسان رہتا ہے ۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں : " دنیا کمانا ہنر نہیں ہے ۔ اگر ہو سکے تو ایک مرتبہ ہی کسی کا دل جیت لے ۔ "

دعوتِ دین کے سلسلے میں جن امور کو خصوصی طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، ان میں ایک یہ ہے کہ بحث بازی سے بچا جائے ۔ حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" اپنے نفس سے تین چیزیں آپؐ نے بالکل دُور کر دی تھیں ۔ بحث ومباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا ۔ "

حقیقت یہ ہے کہ کج بحثیاں زبانیں تو بند کر دیتی ہیں مگر دلوں کو نہیں کھول سکتیں اور لوگ قریب آنے کے بجائے اور زیادہ دُور ہو جاتے ہیں اور اس طرح انسان جیت کر بھی ہار جاتا ہے ۔ جو انسان اس بات پر خوشی محسوس کرتا ہے کہ اس نے ایسی دلیل دی کہ دوسرا جواب نہ دے سکا، وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا اصل مقصد لوگوں کو لاجواب کرنا نہ تھا بلکہ انہیں دین کی طرف مائل کرنا تھا اور انہیں لاجواب کر کے اس نے انہیں دین سے اور بھی زیادہ دُور

کر دیا ہے ـــــ یہ تو اپنی کوششوں کی خود ہی نفی کرنا ہُوا۔

عقل مندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ لوگ تلخ کلامیاں کریں بھی تو داعی برداشت کرکے جواب میں شیریں کلامی ہی سے کام لے اور حسنِ سلوک سے لوگوں کے دلوں کو قریب لانے کی کوشش کرے نہ کہ انہیں اپنی قوتِ استدلال کا تختۂ مشق بنا کر دور بھگائے۔

شیخ سعدیؒ کا مقولہ ہے کہ :

"شیریں کلامی اور نرم زبانی غضبناک انسان (کے غضب) کی آگ پر پانی جیسا اثر کرتی ہے"

حضرت بشر حافیؒ کا فرمان ہے :

"اللہ کی محبت کی نشانی اخلاق اور امر و نہی میں رسولِ خداؐ کی اتباع ہے"

واضح رہے کہ حرم کو براہ راست جاننے کی تکلیف گوارا کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ زیادہ تو وہی ہوتے ہیں جنہیں حرم کی طرف لے جانے والے میرِ کارواں کے کردار اور سلوک سے متاثر ہونا ہوتا ہے اور اگر اسی میں خوئے دلنوازی نہ ہو گی تو پھر اہلِ کارواں کا کارواں سے ٹوٹ جانا یا خود حرم ہی سے بدگماں ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

اس سے زیادہ بدقسمت کون ہوگا جس کی بدخلقی، سخت مزاجی اور سخت گیری کے باعث لوگ دین ہی سے بدظن ہو جائیں۔

لَاتَقۡنَطُوۡا

(نا امید نہ ہو)

سورۃ محمد، آیت ۳۵ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

"پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو، اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔"

اسی سورہ مبارکہ کی آیت سات میں امید دلائی کہ:

"اے لوگو، جو ایمان لائے، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔"

سورۃ ھود، آیت ۱۲۰ میں اس طرح حوصلہ دلایا ہے:

"اور (اے پیغمبر) یہ پیغمبروں کے قصّے جو ہم تمہیں سناتے ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔"

سورۃ ہود ہی کی آیت ۴۹ میں مسلمانوں کو دلاسا دیا ہے:

"پس صبر کرو، انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے۔"

کلام پاک میں جو بار بار مسلمانوں کو تسلی دی جاتی اور امید بندھائی جاتی ہے وہ اس لیے کہ دین کی راہ میں جو دقتیں، مشقتیں برداشت کرنی اور کٹھن گھاٹیاں عبور کرنی پڑتی ہیں، ان سے گھبرا کر وہ کہیں یاس کا شکار نہ ہو جائیں اور اپنے معزز نصب العین ہی سے ہاتھ نہ اٹھا لیں۔ تبلیغ کی راہ بہرحال کوئی پھولوں کی سیج نہیں کہ انسان آرام سے اس پہ لیٹ جائے۔ اس راہ میں تو بڑی بڑی دشت نوردیاں کرنی پڑتی ہیں اور جسم و جان کو زخموں سے چور کرنا پڑتا ہے۔

مولانا رومی مرحوم فرماتے تھے :

"اگر تبلیغ کرنا اتنا ہی آسان کام ہوتا جتنا ہم سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ موسیٰؑ اور محمدؐ کو نہ بھیجتا۔"

آپ کی مراد یہی تھی کہ یہ بڑی اولوالعزمی، ثابت قدمی، حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔ اب جس انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ :

وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ۔ "انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے" (الاسراء:۱۱)

اس سے بعید نہیں کہ ان دشواریوں سے گھبرا کر آس توڑ بیٹھے، اس لیے ضروری تھا کہ بار بار اُسے ثابت قدم رہنے اور ناامیدی سے بچنے کی تلقین کی جاتی ۔

لہٰذا حق کی طرف بلانے والوں کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ راہ کی دقتوں اور بار بار کی شکستوں سے دل برداشتہ ہو کر یاس کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ ان کا ایمان ہوتا ہے کہ اگر ہماری نیت نیک ہے تو جو تگ و دو ہم کر رہے ہیں اس کے بیکار جانے یا کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سورۃ الصّف، آیت ۸ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے فرمایا ہے :

"یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اس آیت کی تشریح میں مفسر نے لکھا ہے :

یہ بات نگاہ میں رہے کہ یہ آیات ۳ھ میں جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھیں جبکہ اسلام صرف شہر مدینہ تک محدود تھا، مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور سارا عرب اس دین کو مٹا دینے پر تلا ہوا تھا۔ احد کے معرکے میں جو زک مسلمانوں کو پہنچی تھی، اس کی وجہ سے ان کی ہوا اکھڑ گئی تھی اور گرد و پیش کے قبائل ان پر شیر ہو گئے تھے۔ ان حالات میں فرمایا گیا کہ اللہ کا یہ نور کسی کے بجھائے بجھ نہ سکے گا بلکہ پوری طرح روشن ہو کر اور دنیا بھر میں پھیل کر رہے گا۔ یہ ایک صریح پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ اللہ کے سوا اس وقت اور کون یہ جان سکتا تھا کہ اسلام کا مستقبل کیا ہے۔ انسانی نگاہیں تو اس وقت یہ دیکھ

رہی تھیں کہ یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے جسے بجھا دینے کے لیے بڑے زور کی آندھیاں چل رہی ہیں۔"
(تفہیم القرآن جلد ۵)

مگر چند ہی سال بعد وہ بڑے زور سے چلنے والی آندھیاں کدھر چلی گئیں اور وہ ٹمٹماتا ہوا چراغ کس طرح مہرِ درخشاں بن کر دور دور تک روشنی پھیلانے لگا۔ یہ وہ حقائق ہیں جو ایک داعی الی الحق کو ہمہ وقت پیشِ نظر رکھنے چاہئیں تاکہ وہ اس یاس اور ناامیدی سے بچا رہے جو گمراہوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹا پیدا ہونے کی بشارت دی تو انہوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ بھلا اس بڑھاپے میں میرے ہاں اولاد ہوگی۔ اس پر فرشتوں نے انہیں بشارت کے برحق ہونے کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ آپ مایوس نہ ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ کے اس خلیل نے جواب دیا۔

"اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوتے ہیں۔" (سورۃ الحجر آیت ۵۶)

حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائی کی جدائی میں سخت غمزدہ ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دوسرے بیٹوں کو جو بظاہر ان دونوں بھائیوں کو واپس لانے سے قاصر نظر آتے تھے، مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے میرے بیٹو، جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے مایوس تو صرف کافر لوگ ہی ہوتے ہیں۔"

(سورۂ یوسف، آیت ۸۷)

رب العالمین بار بار مسلمانوں کو تسلی دیتا ہے کہ میں تمہارا کارساز ہوں، تم مجھ پر توکل رکھتے ہوئے اپنا کام کیے جاؤ اور مخالفین کی مخالفتوں اذیت رسانیوں کے آگے ہار نہ مانو۔

سورۃ الاحزاب، آیات ۱، ۲، ۳ میں بیان ہوا ہے:

"اے نبی، اللہ سے ڈرتے رہو اور کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرنا، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے، پیروی کرو اس حکم کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی کیا جاتا ہے۔ بے شک اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو اور اللہ پہ توکل کرو، اللہ ہی کارساز ہونے کے لیے کافی ہے۔"

اسی سورت کی آیات ۴۵ تا ۴۸ میں بیان ہوا ہے :

"اے نبی ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے اور ہرگز نہ دبو کفّار اور منافقین سے، کوئی پروا نہ کرو اُن کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر اور اللہ کارساز ہونے کے لیے کافی ہے "۔

سورہ الم نشرح میں حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے :

"پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے"۔

یہاں اس بات کو دو دفعہ دہرایا گیا ہے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح تسلی دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی میں اچھے حالات آنے والے ہیں۔

داعی کے لیے وہ مرحلہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اُسے بار بار اپنے مقصد میں شکست ہو رہی ہے اور مخالفین اپنی غلط روی کے باوجود دنیا میں خوب پھل پھول رہے ہیں اور بظاہر نہ تو اُن کے راہِ حق کی طرف آنے کا کوئی امکان ہے اور نہ اُن کے ان وسائل اور ذرائع کے ختم ہونے کے ہی کوئی آثار دکھائی دیتے ہیں، جن سے کام لے کر وہ خود بھی غلط راہوں پر چلتے اور دوسروں کو بھی چلاتے ہیں — بے شک یہ صورتِ حالات بڑی پریشان کن ہوتی ہے۔ تاہم یہ سوچنا بھی بالکل غلط ہے کہ جو افراد یا اقوام بُرے اعمال کے باوجود دنیاوی شان و شوکت اور قوت و طاقت کی مالک ہیں انہیں کبھی ضعف و کمزوری آئے گی ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بداعمالیاں، عاقبت خراب کرنے کے علاوہ خود دنیاوی شان و شوکت اور طاقت و قوت کے لیے بھی گھُن کی حیثیت رکھتی ہیں جس طرح گھُن دانوں کو اندر ہی اندر ہی کھا کر ختم کر دیتا ہے اور خالی چھلکے کا خول رہ جاتا ہے۔ اسی طرح بُرے اعمال بھی

افراد اور اقوام کی طاقت و قوت کو بتدریج چاٹ جاتے ہیں۔ کلام پاک میں جگہ جگہ ایسی پرانی قوموں کا ذکر آتا ہے جو اپنے وقتوں میں بڑی طاقت اور قوت کی مالک تھیں اور سمجھے بیٹھی تھیں کہ انہیں کبھی زوال آئے گا ہی نہیں اور جب انبیاء اور صالحین اُن کی اصلاح کی کوشش کرتے تھے تو ان کوششوں کا جواب حقارت اور شرارت سے دیتی تھیں۔ مگر اُن کی بداعمالیوں نے انہیں کمزور کرتے کرتے آخر تباہی کے گھاٹ لا اُتارا۔

سورۃ الفجر، آیات ۶ تا ۱۴ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا، اونچے ستونوں والے عادِ ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا میں پیدا نہیں کی گئی تھی اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں اور میخوں والے فرعون کے ساتھ۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (دنیا کے) ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بڑا فساد پھیلایا تھا۔ آخر کار تمہارے رب نے اُن پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔"

عاد اور ثمود عرب کی قدیم اقوام میں سے دو قومیں تھیں جو اپنے عہد میں بڑے زور اور قوت کی مالک تھیں۔ مگر ان کی دینی اور اخلاقی بے راہروی نے آخر انہیں برباد کر کے رکھ دیا۔

سورۃ آلِ عمران آیات ۱۹۶، ۱۹۷ میں بیان ہوا ہے:

"(اے نبیؐ) دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے۔ پھر ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگا جو بدترین جائے قرار ہے۔"

سورۃ الدخان، آیات ۲۵ تا ۲۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کی غرقاب ہو جانے والی فوج کے متعلق فرمایا:

"کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے، ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو اُن چیزوں کا وارث بنا دیا، پھر نہ آسمان اُن پر رویا

نہ زمین اور نہ انہیں مہلت دی گئی۔"

یہ تو چند مثالیں ہیں، کلام پاک میں بے شمار آیات صرف اُن طاقتور اور مغرور اقوام کے بارے میں آئی ہیں جنہیں اپنی شان و شوکت پر بڑا غرّہ تھا۔ مگر ان کی شان و شوکت انہیں اُن کی بداعمالیوں کے انجام سے نہ بچا سکی۔ لہٰذا منکرین حق کا طاقت و قوت کا مالک ہونا یا دنیا میں بڑا صاحبِ اختیار ہونا کسی دل شکستگی کا باعث نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ داعی جس کا پیغام لے کر اٹھا ہے اس کی طاقت و قوت بہر حال سب پر غالب ہے۔

راہِ حق کی طرف بلانے والوں کے دل میں یاس پیدا ہونے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے دلوں میں یہ خواہش بہت زبردست ہوتی ہے کہ ان کی کوششوں کے نتائج بہت جلد نکل آئیں حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو لوگ حق کی راہ میں تگ و دو کریں وہ اپنی زندگیوں ہی میں حق کا بول بالا ہوتا بھی دیکھ لیں۔ آدم کی اولاد کو سدھارنا ایک بڑا لمبا اور وقت طلب کام ہے۔ ایک جانور کو چند ہفتوں یا چند مہینوں میں سدھایا جا سکتا ہے مگر انسان کو سدھانے کے لیے عموماً بہت لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تبلیغی کوششوں کے نتائج کوئی ایسی شے نہیں جنہیں ترازو میں رکھ کر تولا جا سکے یا پیمانے میں ڈال کر ناپا جا سکے کہ اتنے نتائج نکلے ہیں کہ چھٹانک کہ سیر کہ من۔ ہو سکتا ہے کہ نتائج نکل رہے ہوں مگر ہمیں نظر نہ آتے ہوں جس شخص کے سامنے آپ نے حق کو پیش کیا ہے اور محسوس کیا ہے کہ وہ متاثر نہیں ہوا، کم از کم اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ اس کے کان میں بات پڑ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کل اس کے حالات میں کچھ ایسی تبدیلی آ جائے جو اس کے دل کو بھی بدل دے اور وہی الفاظ جو کبھی سنے گئے تھے، تو مؤثر نہیں تھے اب مؤثر ہو جائیں۔ ایسے ہی داعی کو اس بات کی بھی حد مناسب سے زیادہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اپنی کوششوں کے نتائج وہ ضرور اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لے۔ آخر ہم جس خدا پر یقین رکھتے ہیں، وہ کبھی تو ہمیں آنکھوں سے نظر نہیں آتا، نہ ہمارے دوسرے حواس اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ پھر بھی ہم اس پہ ایمان رکھتے ہیں کیونکہ ہمیں خدا کے سچے نبیؐ نے بتایا ہے کہ وہ موجود ہے اور قادرِ مطلق ہے اور اس کے بعد پھر ہم

اُس کی قدرتوں سے بھی اسے پہچان لیتے ہیں کہ وہ موجود ہے۔

ایسے ہی یہ بات بھی خدا کے سچے نبیؐ نے بتائی ہے کہ خلوص دل سے کی ہوئی کوششیں رائگاں نہیں جاتیں اور انسان کی گزشتہ تاریخ بھی صاف بتا رہی ہے کہ مخلصانہ طور پر کی جانے والی تگ و دو کے نتائج ضرور نکلتے ہیں۔ یہ وہ راہ ہے جس میں دیر تو ضرور ہے مگر اندھیر بالکل نہیں۔ ایک مخلص مومن کا کام یہی ہے کہ اپنی جدوجہد میں کمی نہ آنے دے۔ اس جدوجہد کو کامیابی سے کب ہمکنار ہونا ہے — اسے خدا پر چھوڑ دے، اس راہ میں جلدبازی اور بے صبری اس معزز کام کے لیے عار کی حیثیت رکھتی ہے۔

جس زمانے میں مکّے کے سنگدل لوگ رسولِ خداؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر ظلم و ستم توڑ رہے تھے، انہیں دنوں کا ایک واقعہ حضرت خباب بن الارتؓ بیان فرماتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے سائے میں چادر سر کے نیچے رکھے آرام فرما رہے تھے ہم آپؐ کے پاس شکایت لیکر پہنچے ہم نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہ! کیا آپؐ ہمارے لیئے خدا سے مدد طلب نہیں فرماتے آپؐ ہمارے لیے خدا سے دعا نہیں کرتے"۔ نبیؐ نے یہ سن کر فرمایا۔ "تم سے پہلے ایسے لوگ گزر رہے ہیں کہ ان میں سے بعض کے لیے گڑھا کھودا جاتا، پھر اُس کو اس گڑھے میں کھڑا کر دیا جاتا، پھر آرا لایا جاتا اور اسے اس کے سر پر رکھا جاتا۔ اور اسے کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتا، اور اس کے جسم میں لوہے کے کنگھے چبھوئے جاتے جو گوشت سے گزر کر ہڈیوں اور پٹھوں تک پہنچ جاتے، مگر وہ خدا کا بندہ حق سے نہ پھرتا۔ قسم ہے خدا کی، اللہ اس دین کو مکمل کر کے رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار (یمن کے دار الخلافہ) صنعاء سے حضر موت تک کا سفر کرے گا اور راستے میں خدا کے سوا اُس کو کسی کا خوف نہ ہوگا۔ ....

...... اس حدیث کے آخر میں آپؐ نے فرمایا: لیکن تم جلدی مچا رہے ہو۔

(بخاری)

جلدی مچانا ایک سچے داعی کے شایانِ شان نہیں۔ اسی لیے تو حضورؐ نے اُن عاشقانِ پاک طینت کی گھبراہٹ پر بھی اظہارِ افسوس فرمایا۔ داعی کا کام یہی ہے کہ حتی الامکان عمدہ

اور مؤثر طریقے سے لوگوں کے سامنے دین کو پیش کرے اور کوشش کرے کہ وہ اسے قبول کریں۔ باقی کسی کا کان پکڑ کر اس کا دل بدلا دینے کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ پر بھی نہیں ڈالی تھی۔ داعی کی کوششوں کا مقصد یہ نہیں کہ ضرور اسی کے ہاتھوں دین قائم ہو جائے۔ مقصد تو اس قادر مطلق ہستی کو خوش کرنا ہے جسے درحقیقت دین کو قائم کرنا ہے۔ داعی کو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ علیم و بصیر اس کی تمام کوششوں کو دیکھ رہا ہے اور ضرور ان کی قدردانی فرمائے گا۔ یہی اصل کامیابی ہے — باقی رہا دین کا عملاً قائم ہو جانا تو وہ قادر مطلق جب چاہے گا اسے قائم کر دیگا۔

سورۃ النمل، آیات ۹۱، ۹۲ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"(اے نبیؐ ان سے کہہ دو) کہ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر (مکہ) کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔ اب جو ہدایت اختیار کرے گا، وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں۔"

سورۃ البقرہ، آیت ۲۷۲ میں ارشاد ہوا ہے:

"(اے نبیؐ) لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے بلکہ ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔"

سورۂ یونس، آیت ۱۰۸ میں ارشاد ہوا ہے:

"(اے نبیؐ) کہہ دو کہ لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اُس کی راست روی اُسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اُس کی گمراہی اُسی کے لیے تباہ کن ہے اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔"

سورۃ الغاشیہ، آیت ۲۱ تا ۲۶ میں حضورؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اچھا تو (اے نبیؐ) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔ البتہ جو شخص منہ موڑے گا اور انکار کرے گا تو اللہ اس کو بھاری سزا دے گا۔ ان لوگوں کو پلٹنا ہماری طرف ہی ہے، پھر ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمہ ہے۔"

سورہ قٓ، آیت ۴۵ میں ارشاد ہوا ہے:

"(اے نبیؐ)، جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور تمہارا کام ان سے جبرًا بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔"

سورۂ الفرقان، آیات ۷ اور ۸ میں بیان ہُوا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) ڈراتا، یا (اور کچھ نہیں تو) اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا...."

کفار کے اس گستاخانہ اعتراض کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"تو (اے پیغمبر) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس بات پہ تنگ دل ہو کہ وہ کہیں گے، اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا، یا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا—— تم تو محض ڈرانے والے ہو، آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے۔" (سورہ ہود، آیت ۱۲)

داعی اگر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لے گا کہ میرا کام یہی ہے کہ حتی الامکان بہتر سے بہتر طریقے سے اپنا فرض ادا کرتا رہوں، نتائج پیدا کرنا خدا کا کام ہے، میرا نہیں تو اس کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اس دل شکستگی سے بچ جائے گا جو کوششوں کو بظاہر بے نتیجہ دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ جب ہمارا کام صرف یہی ہے کہ جسم و جان کی تمام طاقتوں سے کام کرتے چلے جائیں تو پھر نتائج کے بارے میں حد سے زیادہ فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جب قادرِ مطلق کو نتائج نکالنے ہیں، وہ جب چاہے گا نتائج نکل آئیں گے۔

کوششوں کے نتائج بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو فوری طور پہ نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو ایک مدت کے بعد نکلتے ہیں۔ انسان اپنی محدود نگاہی کے باعث اُن نتائج ہی کو دیکھتا رہتا ہے جو جلد نکلنے والے ہوتے ہیں اور

دیر کے بعد نکلنے والے نتائج کی طرف اس کا دھیان بہت کم جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اوّل الذکر کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ دُوررس اور پائیدار ہوتے ہیں۔

ایسے ہی ہم عادی ہیں اس بات کے کہ اشیاء کے اجزاء کی طرف زیادہ توجہ دیں، بجائے اس کے کہ اشیاء کو بحیثیت مجموعی دیکھیں۔ یاس اور دل شکستگی عموماً اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان دُور تک دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ اگر ہم انسانی تاریخ پر عموماً اور تاریخ اسلام پر خصوصاً بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالیں تو یہ دیکھ کر ہماری حیرانی کی حد نہیں رہتی کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے یاس اور ناامیدی کے لیے کوئی وجہ جواز رکھی ہی نہیں۔ تاریخ میں ان گنت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک دور میں جو اصلاحی کوششیں کی گئیں اور بظاہر ان کوششوں کے کوئی نمایاں نتائج بھی نظر نہ آئے اور مخالفین نے بزعم خود انہیں "دبا" بھی دیا۔ تاہم کچھ عرصہ گزرنے پر وہی کوششیں جو پہلے بے نتیجہ نظر آتی تھیں، بارآور ہوگئیں اور مخالفین یا تو اپنا عروج کھو بیٹھے یا خود ہی ان اصولوں کے حامی ہو گئے جن کو دبانے کی کوشش وہ کرتے رہے تھے۔ اسی طرح بارہا ایسا ہوا کہ زور آوروں نے کمزوروں کو جی بھر کے سزائیں دیں، مگر تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ وہ مظلوم زور والے ہو گئے اور زور آور کمزوری کا لقمہ بن گئے۔ ذیل میں کچھ تاریخی نشیب و فراز پیش کیے جاتے ہیں جو راہِ حق کے داعیوں کے لیے بہت کچھ تقویتِ قلب کا باعث بن سکتے ہیں۔

انسانی تاریخ میں جو افراد ظالموں کی حیثیت سے خاص طور پر مشہور رہے ہیں، اُن میں ایک چنگیز خاں بھی تھا۔ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی اپنی تالیف "تاریخ ایران" جلد دوم میں چنگیز کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"تاریخ عالم میں جس قدر سفاک اور خونخوار بادشاہ ہوئے ہیں، چنگیز خاں اُن سب سے بڑھ کر تھا کیونکہ اس کے عہد میں نوع انسان کا جتنا خون بہایا گیا اور جتنی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوئیں کسی فاتح کی لشکر کشی میں اُن کی مثال نہیں ملتی۔ کسی عظیم شہر کے لاکھوں انسانوں کا خون بہانے کے لیے چنگیز خاں کے ہونٹوں کی صرف ایک جنبش کافی تھی۔"

چنگیز کے اسلاف منگول خاندان سے تعلق رکھتے تھے، منگولوں کو تاتار بھی کہتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری میں ان تاتاریوں اور مسلمانوں کے درمیان بہت جنگیں ہوئیں اور ان جنگوں میں وحشی تاتاریوں نے مسلمانوں پر وہ وہ ظلم ڈھائے جنہیں پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مسلمانوں کے شہرۂ آفاق شہر بخارا، سمرقند، نیشاپور، مرو، ہرات وغیرہ جو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے مرکز تھے، ان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی گئی، اور لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ "تاریخ ایران" جلد دوم میں ان تباہیوں کا جو حال بیان ہوا ہے ذیل میں اس کا خلاصہ درج ہے:

"تاتاری نعرے لگاتے بخارا میں داخل ہوئے ..... بخارا کی جامع مسجد کے پاس پہنچ کر چنگیز رک گیا اور پوچھا کہ کیا یہ سرائے سلطانی ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ یہ خدا کا گھر ہے۔ وہ گھوڑے سے اتر پڑا۔ گھوڑوں کی باگیں شہر کے مشائخ اور اشراف کے ہاتھوں میں دیں۔ کلام اللہ رکھنے کے صندوق کو اس نے گھوڑوں کا چارہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا۔ تاتاریوں نے اہلِ بخارا کی دولت سمیٹ کر شہر کو آگ لگا دی۔ چند دن میں شہر کا اکثر حصہ جل کر خاکستر ہو گیا ..... اہلِ بخارا جو قتل عام سے بچ گئے، شہر کی بربادی پر آنسو بہاتے ستاروں کی طرح بکھر گئے۔"

"بخارا کی سرزمین کو تہ و بالا کر کے کچھ وقت چنگیز خاں نے وادی زرفشاں میں گزارا۔ پھر اسی سال سمرقند روانہ ہوا۔ سمرقند بھی بخارا کی طرح بڑا پُر رونق شہر تھا۔ شہر کی حفاظت کے لیے کئی ہزار سوار متعین تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ مدافعت کی۔ آخر قاضی شہر اور شیخ الاسلام خود چنگیز خاں کے پاس گئے۔ امان مانگی اور شہر کے دروازے کھلوا دیئے۔ چنگیز خاں نے ان دو علماء کے پچاس ہزار پیرؤں کو امان دے دی۔ باقی لوگوں کو شہر بدر کر کے صحرا کی طرف دھکیل دیا، اور ان کا مال و اسباب لوٹ کر گھروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ امراء اور اہل لشکر سب قتل کر دیئے۔"

"نسا کے مقام پر مسلمان افواج سے منگولوں نے مقابلہ کیا جس میں ایک منگول سردار مارا گیا۔ اس کا انتقام کچھ اس طرح لیا گیا کہ نسا کے مرد، عورتیں، بچے ایک ایک کر کے

تہ تیغ کر دیئے گئے ۔"

"نیشاپور میں مسلمانوں اور منگولوں کے درمیان خاصا مقابلہ ہوا جس میں چنگیز خاں کا داماد تو غاچار مارا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مؤرخ عطا ملک جوینی کا بیان ہے کہ چنگیز خاں نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ یہ کونسا شہر ہے ۔ اس نے جواب دیا کہ یہ وہ شہر ہے جہاں آپ کا داماد توغاچار مارا گیا ہے ۔ یہ سن کر چنگیز کا غصہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح آگ اگلنے لگا اور اس نے حکم دیا کہ نیشاپور کی ہر زندہ مخلوق کو ہلاک کر دیا جائے ۔ چنانچہ وہاں کے انسان تو انسان کتے اور بلیاں بھی مار دی گئیں ۔"

"نیشاپور کی فتح کے بعد (چنگیز خاں کے بیٹے) تولی نے سبزوار پر حملہ کیا ۔ یہاں کی آبادی ستر ہزار تھی ۔ جس کا بیشتر حصہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ اب تولی مرو پر ایک بڑا حملہ کرنا چاہتا تھا ۔ جو کبھی سلطان سنجر کا دارالخلافہ تھا اور تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا ۔ وہاں اب بھی علماء اور فضلاء کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ وہاں کے کتب خانے دنیا بھر میں مشہور تھے ۔ تولی نے اہلِ شہر کو امان دینے کے جھوٹے وعدے کر کے شہر پر تسلط جما لیا اور وہاں کے پانچ لاکھ شہریوں کو تہ تیغ کر کے علم و تہذیب کے مرکز کو لاشوں کے شہر میں بدل ڈالا ۔ یہاں کی جامع مسجد کو ان خدا ناشناس تاتاریوں نے آگ لگا دی اور شہر کی اس طرح اینٹ سے اینٹ بجائی کہ پھر ایک سو سال تک وہاں کھنڈرات کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا"۔

چنگیز خاں نے ۶۲۴ھ میں وفات پائی اور اس کے بعد اس کے کچھ جانشینوں کے ہاتھ سے گزرتی ہوئی حکومت اس کے پوتے منگو قاآن تک پہنچی منگو قاآن نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو عباسیوں کے پایہ تخت بغداد کو فتح کرنے کے لیے بھیجا ۔ سقوط بغداد تاریخ اسلام کا ایک الیسا زخم ہے جس کا ذکر اب بھی خون کے آنسو رلاتا ہے اور اس کی تہ میں خود مسلمانوں کا اپنا دینی ضعف اور باہمی بے اتفاقی تاتاریوں کے ظلم سے کم نہ تھی ۔ بغداد پر حملہ کرنے کے لیے جو منگول لشکر بھیجا گیا ، اس کی تعداد ایک لاکھ تھی ۔ مگر آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ بیس ہزار سے زیادہ فوج مہیا نہ کر سکا ۔ "تاریخ ایران" میں سقوطِ بغداد کا حال بیان کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے :

"۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں منگول بغداد میں داخل ہوئے اور ہلاکو خاں کے حکم سے پورے سات دن تک لوٹ مار اور قتلِ عام جاری رہا۔ مورخین کے بیان کے مطابق یہاں آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ بغداد کے قتل و غارت کے سامنے چنگیزی ہلاکتیں بھی ماند پڑ گئیں۔ ہلاکو نے اسلامی دنیا کے اس مرکز کو، جہاں سے چھ سو سال تک اسلامی تہذیب کے سوتے پھوٹتے رہے، تباہ کر دیا۔ یہاں کے علم و ادب کے خزانے، جو صدیوں سے چلے آتے تھے، برباد کر دیئے۔ علماء، جن کے علم و فضل کی شہرت چار دانگِ عالم میں تھی، تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ علوم و فنون کا یہ گہوارہ کھنڈرات کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ غرض وہ تباہی ہوئی جس کا بیان تاریخ میں نہیں سما سکتا۔"

یہ تھا وہ دورِ ابتلاء جس میں سے مسلمان ساتویں صدی ہجری میں گزر رہے تھے۔ اس وقت جس طرح ان کی صدیوں کی جمی جمائی تہذیب کے مظاہر کو ایک ایک کر کے برباد کیا جا رہا تھا، ان کے عظیم الشان کتب خانے جلائے جا رہے تھے، اُن کی شاندار عمارتیں مسمار کی جا رہی تھیں، اُن کے علوم و فنون تباہ کیے جا رہے تھے، اُن کے پورے پورے شہر قبرستانوں کی شکل اختیار کر رہے تھے ــــ اُس وقت کون دیکھنے والا یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ قوم پھر کبھی قوت و طاقت حاصل کر سکے گی اور دوبارہ عروج سے ہمکنار ہو سکے گی۔ مگر بعد میں ہوا کیا؟

"تاریخ ایران" جلد دوم میں جو حالات مرقوم ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہلاکو خاں بدھ مت کا پیرو تھا، مگر اس کی بیوی عیسائی تھی اور اس کا میلان عیسائیوں کی طرف بہت زیادہ تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اباقا خاں تخت پر بیٹھا۔ اس کی ماں اور بیوی دونوں عیسائی تھیں اور اس کا میلان بھی عیسائیت کی طرف بہت زیادہ تھا۔ اس کی اسلام دشمنی کے باعث لوگوں کو اس سے سخت نفرت تھی۔ ۶۸۰ھ میں اباقا خاں کا انتقال ہونے پر اس کا بھائی تکودار تخت پر بیٹھا۔ وہ بھی اگرچہ شروع میں عیسائیت ہی کی طرف مائل تھا، مگر جیسے جیسے اس کا ربط ضبط مسلمانوں سے بڑھتا گیا وہ اسلام کی طرف مائل ہوتا گیا۔ اور بالآخر اس نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام احمد رکھا، اور اس طرح

دشمنِ اسلام ہلاکو خاں کا اپنا بیٹا ہی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔
احمد تکودار کے مسلمان ہونے سے قدرتی طور پر منگولوں کو بہت غصّہ آیا اور انہوں نے بالآخر اسے ہلاک کر دیا۔ مگر یہ ہلاکت ایک فرد کی ہلاکت تھی۔ اس سے اسلام کی راہ کو روکا نہ جا سکا۔

۶۹۴ھ میں جب ہلاکو خاں کے پوتے ارغون کا بیٹا غازان خاں حکمران بنا تو اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ غازان خاں اس خاندان کے نامور بادشاہوں میں سے تھا۔ مسلمان ہو کر اس نے اپنا لباس بھی بدل لیا، دستار زیبِ سر کی اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کر لیے۔ غازان خان نے ذاتی طور پر ہی اسلام قبول نہ کیا بلکہ اس نے مملکت میں اس مضمون کے فرمان بھیجے کہ تمام امور اسلامی شریعت کی رو سے طے پائیں گے اور زیردستوں پر کوئی ظلم کا ہاتھ نہیں بڑھائے گا۔ غازان خاں کے متعلق یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے پایۂ تخت تبریز میں مساجد اور سرائیں تعمیر کرائیں اور مدارس قائم کرائے جن میں اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔
۷۰۴ھ میں غازان خاں کا بھائی الجائتو خدا بندہ حکمران بنا اور اس کے متعلق بھی یہی آتا ہے کہ اس نے آئین اسلام کی پابندی کی —— اور اس کے بعد اس خاندان میں اسلام چلتا گیا۔

یہ نو مسلم حکمران اولاد تھے اُسی چنگیز کی، جس کی اسلام دشمنی اور ظلم و ستم کا حال اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔
زمانہ کچھ اور آگے بڑھا۔ انہیں تاتاریوں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا ان کی آئندہ نسلوں میں عثمان خاں پیدا ہوئے۔ جنہوں نے ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جو تاریخ میں "دولت عثمانیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ عثمانی خاندان نے اتنا عروج حاصل کیا کہ ان کی سلطنت شرقاً غرباً پھیلتی کہیں سے کہیں جا پہنچی اور آخر یورپ کے اندر گھس گئی۔ اہلِ یورپ نے ترکوں کو اپنی سرزمین سے نکالنے کی باتیں تو بہت کیں مگر عملاً نہ صرف یہ کہ وہ انہیں نکال نہ سکے بلکہ نویں صدی ہجری میں عثمانی خاندان کے ساتویں حکمران سلطان

محمد فاتح نے بازنطینی رومی سلطنت کے پایۂ تخت قسطنطنیہ کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔

قسطنطنیہ دو براعظموں (ایشیا اور یورپ) دو سمندروں (بحرِ روم اور بحرِ اسود) کے نقطۂ اتصال پر واقع ہے۔ وہ اپنی جغرافیائی پوزیشن اور اپنی بے پناہ مضبوطی کے باعث ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ قسطنطنیہ کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ سلطان محمد فاتح کا عہد آنے تک مختلف عہدوں میں مسلمان اسے فتح کرنے کے لیے گیارہ دفعہ اس کا محاصرہ کر چکے تھے مگر ہر بار ناکام رہے تھے۔

قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا مطلب بازنطینی سلطنت کو ختم کرنا تھا۔ سلطان نے دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلے زبردست تیاریاں کیں۔ جناب محمد عزیز مؤلف "دولت عثمانیہ" کے بیان کے مطابق سلطان محمد نے قسطنطنیہ سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کرایا۔ حملے کے لیے ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کی گئی۔ اس وقت تک توپوں کا استعمال شروع ہو چکا تھا مگر سلطان نے مروّجہ توپوں کو ناکافی سمجھتے ہوئے نہایت عظیم الشان توپیں بنوائیں جو اپنی جسامت اور طاقت کے لحاظ سے بے نظیر تھیں۔ اس کے علاوہ قسطنطنیہ کے محاصرے کے لیے ایک سو اسی[۱۸۰] جہازوں کا بیڑا بھی تیار کروایا گیا۔ مؤلف "دولت عثمانیہ" سقوط قسطنطنیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ کی رات ترکوں نے تسبیح و تہلیل میں گزاری۔ فریضۂ فجر ادا کرنے کے بعد حملہ شروع ہوا۔ حملہ مختلف سمتوں سے ہو رہا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ زور اس حصّے پر تھا جو دروازہ سینٹ رومانس کے قریب تھا۔ وہاں کی دیوار ترکی گولہ باری سے بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ عثمانی اور یونانی سپاہیوں کی تعداد میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ لیکن دوپہر سے پہلے تک انتہائی کوشش اور فتح کی پوری امید کے باوجود عثمانی فوج کا ایک سپاہی بھی شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ (عیسائی بادشاہ) قسطنطین اور اس کے ساتھیوں نے اسی روز حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا۔ اور ترکوں کی باڑھ کو بے حد پامردی سے روکتے رہے۔ لیکن محمد بھی عزم و استقلال کا مجسّمہ تھا۔ وہ ابتدائی ناکامیوں سے متاثر نہ ہوا۔

اور اب خود اپنی (مخصوص فوج) ینی چری کے دستوں کو لے کر آگے بڑھا۔ یونانی اس وقت تک بالکل خستہ ہو چکے تھے۔ اُن میں تازہ حملے کی تاب نہ تھی...... قسطنطین نے خود موقع پر پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لی، مگر ینی چری کا حملہ اتنا سخت تھا کہ شہنشاہ اور اس کے بہادر سپاہیوں کی جانبازی زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکی۔ ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس ہمراہیوں کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا۔ اور اگرچہ حسن اور اس کے اٹھارہ ساتھی فوراً مار کر گرا دیئے گئے، تاہم باقی کامیاب رہے اور اس کے بعد اور ترکی دستے بھی یکے بعد دیگرے پہنچتے گئے۔ یونانیوں کے لیے اب کوئی امید باقی نہ رہی۔ قسطنطین نے اپنی سرخ عبا، جو قیاصرہ کی امتیازی پوشاک تھی، اتار کر پھینک دی۔ اور ترکی فوج کے بڑھتے ہوئے طوفان میں گھس کر ایک جانباز اور سرفروش سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا۔

چند لمحوں کے اندر قسطنطنیہ فاتحوں کے پے در پے دستوں سے بھر گیا........ ظہر کے قریب سلطان محمد فاتح اپنے وزرا اور امرائے سلطنت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ سینٹ صوفیا کے گرجے کے پاس پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا اور اس عالیشان معبد میں داخل ہو کر، جس میں گیارہ سو برس سے تین خداؤں کی پرستش ہوتی آئی تھی، خدائے واحد کی تسبیح و تقدیس کے لیے سربسجود ہوا اور موذن کو حکم دیا کہ اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کے لیے آواز دے۔

فتح کے دوسرے روز سلطان نے شہر کا جائزہ لیا۔ جب قیاصرہ کے شاہی محل میں پہنچا اور اس کے ویران اور اُجڑے ہوئے ایوانوں پر نظر پڑی تو بے اختیار اس کی زبان پر یہ شعر آ گیا۔

پردہ داری می کند در قصرِ قیصر عنکبوت

بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

(قیصر کے محل میں مکڑی جالا تن کر پردہ داری کر رہی ہے اور شہنشاہ افراسیاب کے گنبد میں اُلو بول کر نوبت بجا رہا ہے)

واضح رہے کہ سقوطِ بغداد کا سال ۶۵۶ھ ہے اور فتح قسطنطنیہ کا ۸۵۷ھ۔ بغداد

کھوتے وقت مسلمان ذلت کی اس حالت میں تھے اور اب قسطنطنیہ لیتے وقت وہ عزت کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے۔ جو لوگ علاقے، نسل، رنگ اور زبان کو قومیت کی بنیاد بناتے ہیں وہ کہیں گے کہ ساتویں صدی ہجری کی ذلت ایرانیوں کی ذلت تھی اور نویں صدی ہجری کا عروج ترکوں کا عروج تھا۔ مگر اسلام جو قومیت کی بنیاد ان ہیچ و پوچ چیزوں پر نہیں بلکہ اصولوں پر رکھتا ہے۔ اس کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ساتویں صدی ہجری کی ذلت بھی مسلمانوں کی ذلت تھی اور نویں صدی ہجری کا عروج بھی مسلمانوں کا عروج تھا۔ جس حامی و ناصر مالک نے انہیں ذلت کے اس مقام کے بعد عزت کے اس رتبے پر پہنچایا، اس کی بارگاہ سے ناامید ہونا ایمان کی کمزوری کے علاوہ کوتاہ نظری کا ثبوت بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اے آدم کی اولاد، اس رؤف و رحیم خالق کی اس مملکت میں یاس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

جب حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں کنوئیں میں ڈالا تھا تو انہیں کیا پتہ تھا کہ ایک دن ہمارا یہی بے بس بھائی ایک سردار با اقتدار ہوگا اور ہم اس کے حضور میں دست بستہ کھڑے درخواست گزار رہے ہوں گے کہ:

یٰٓاَیُّھَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَ اَھْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَۃٍ مُّزْجٰۃٍ فَاَوْفِ لَنَا الْکَیْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَا اِنَّ اللّٰہَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ۔ (سورہ یوسف، آیت ۸۸)	"اے سردار با اقتدار، ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں۔ آپ ہمیں بھرپور غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں۔ اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔"

جب بنو اسرائیل مصر میں فرعون کے ہاتھوں شدید قسم کی ذلتیں اور ظلم سہہ رہے تھے اور ان کی نسل ختم کرنے کے لیے ان کے بیٹوں کو قتل کیا جا رہا تھا، اس

وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ زبردست فرعون تو غرق ہو جائے گا اور یہ زیردست بنو اسرائیل ایک دن اس عروج کو پہنچ جائیں گے کہ دینی عروج کی انتہا یعنی نبوت اور دنیاوی عروج کی انتہا یعنی بادشاہی دونوں یہاں اکٹھے جمع ہو جائیں گی۔ فرعون کے ہاتھوں انتہائی ذلتیں سہنے والے انہیں بنی اسرائیل کی نسل میں آئندہ چل کر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ پیدا ہوئے اور وہ دونوں باپ بیٹا بیک وقت نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ اور حضرت سلیمانؑ کو تو خدا نے وہ سلطنت عطا فرمائی تھی کہ ہوائیں، پرندے اور جن بھی ان کے ماتحت تھے اور وہ پرندوں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ سورۃ النمل، آیت ۱۶ میں بیان ہوا ہے:

"اور داؤد کا وارث سلیمانؑ ہوا اور اس نے کہا۔ لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں۔ بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے"۔

"سلیمان کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے"۔

(سورۃ النمل، آیات ۱۶-۱۷)

"اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا۔ صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینہ کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک۔ ہم نے اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا ایک چشمہ بہا دیا اور ایسے جن اس کے تابع کر دیئے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے۔"

(سورہ سبا، آیت ۱۲)

یہ عروج اسی قوم کو ملا تھا جو کچھ صدیاں پہلے مصر میں انتہائی ذلت کی زندگی گزار رہی تھی۔

شعبان ۴۹۲ھ میں جب مسلمانوں کی باہمی بے اتفاقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یورپ کی عیسائی صلیبی فوجوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس چھین لیا تو انہوں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ خود ایک عیسائی فرانسیسی مورخ میشو لکھتا ہے:

"بیت المقدس کی فتح میں عیسائیوں نے ایسے اندھے تعصب کا ثبوت دیا جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ عربوں کو زبردستی اونچے برجوں اور بلند مکانوں کی چھتوں سے گرا دیتے تھے، آگ میں زندہ جلا دیتے تھے، گھروں سے نکال کر میدانوں میں جانوروں کی طرح گھسیٹتے تھے، مقتول مسلمانوں کی لاشوں پر لے جا کر مسلمانوں کو قتل کرتے تھے کئی ہفتوں تک مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے۔ مشرق و مغرب کے بیان کے مطابق انہوں نے ستر ہزار مسلمانوں سے زیادہ تہ تیغ کیے۔"

جب مسلمان اس بے بسی کی حالت میں تھے، اس وقت کسے معلوم تھا کہ ایک صدی کے اندر اندر مسلمان دوبارہ اس قدر قوت و طاقت حاصل کر لیں گے کہ یورپ کی متحدہ طاقت کو شکست فاش دیتے ہوئے بیت المقدس کو پھر آزاد کرا لیں گے۔ شاہ معین الدین اپنی "تاریخ اسلام" میں بیت المقدس کی بازیابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جمعہ ۲ رجب ۵۸۳ھ مطابق ستمبر ۱۱۸۷ء کو صلیبیوں نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور اکانوے ۹۱ سال کے بعد پھر خدا کا یہ پاک گھر اس کے حقیقی پاسبانوں کے قبضے میں آ گیا۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ تاریخ معراج نبویؐ کی تھی۔"

عیسائیوں نے ۴۹۲ھ میں بیت المقدس پر قبضہ کرتے وقت جو ظلم و ستم ڈھائے تھے، اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۳ھ میں اس پہ دوبارہ قبضہ کرتے وقت جو انتہائی شریفانہ طرزِ عمل اختیار کیا اس کے بارے میں خود ایک مشہور عیسائی مصنف لین پول لکھتا ہے :

"صلاح الدین نے پہلے کبھی اپنے آپ کو ایسا عالی ظرف اور باہمت نائٹ ثابت نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ اس موقع پر کیا جبکہ بیت المقدس مسلمانوں کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ اس کی سپاہ اور معزز ذمے دار افسروں نے، جو اس کے ماتحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا۔ یہ سپاہی ہر قسم کے ظلم و زیادتی کو روکتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہرگز کوئی واقعہ، جس میں کسی عیسائی کو کوئی گزند پہنچا ہو، پیش نہیں آیا ......"

بیت المقدس کے مسلمانوں کے چھن جانے اور پھر دوبارہ مل جانے کے درمیان

صرف اکانوے سال کا فاصلہ ہے۔

خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے نشیب و فراز مسلمانوں کے لیے حد درجے تقویت قلب کا باعث ہیں۔ ہجرت کی رات جب آپؐ نے مکّہ چھوڑا، اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں :

"کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا۔ آنحضرتؐ اُن کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے۔ کعبہ کو دیکھا اور فرمایا :

"مکّہ، تو مجھے تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔"

اس واقعے سے صرف آٹھ سال بعد جب آپؐ نے مکّہ فتح کر لیا تھا اور اس میں فاتحانہ داخل ہو رہے تھے .... تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھے۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا۔ قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا۔ پھر جہینہ، ہزیم، سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے۔ ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتا تھا۔ سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں ..... سب سے آخر میں کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا، جس کے پرتو سے سطحِ خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔"

(سیرۃ النبیؐ، جلد اوّل)

سنہ ۶ھ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چودہ سو ساتھیوں کے ساتھ حرم کی زیارت کے لیے مکّے کی طرف چلے، حالانکہ آپؐ احرام باندھے ہوئے تھے مگر کفارِ قریش نے آپؐ کو اندر نہ آنے دیا۔ اس وقت حدیبیہ کے مقام پر کفار اور مسلمانوں کے درمیان کچھ گفت و شنید ہوئی، جس کے نتیجے کے طور پر ایک معاہدہ کر

لیا گیا۔ جسے "صلح نامۂ حدیبیہ" کہا جاتا ہے۔ اس صلح نامے کی شرائط ایسی تھیں کہ بظاہر اس سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے دب کر صلح کی ہے۔ جب یہ صلح نامہ لکھا جانے لگا تو قریشیوں کے نمائندے سہیل بن عمرو نے نکتہ چینی، ضد اور ہٹ دھرمی کی انتہا کر دی۔

حضورؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ معاہدے کو تحریر میں لائیں۔ جب حضرت علیؓ نے معاہدے کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو سہیل نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ یوں نہ لکھو بلکہ اس طرح لکھو جیسے ہم پہلے لکھتے آئے ہیں۔ وہ لوگ بِاسْمِكَ اَللّٰهُمَّ لکھا کرتے تھے۔ حضورؐ نے یہ بات مان لی۔ پھر آگے لکھا گیا کہ

"یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کیا"۔

سہیل نے پھر اعتراض کیا اور کہا، اگر ہم آپؐ کو رسول اللہ تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کاہے کا تھا۔ رسول اللہ نہ لکھا جائے بلکہ آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں۔

حضورؐ نے یہ بات بھی مان لی اور حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو۔ حضرت علیؓ سہیل کے اس اعتراض پر برافروختہ ہو کر بولے "میں ہرگز آپؐ کا نام نہیں مٹاؤں گا۔"

مگر حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔ شرائطِ صلح حسبِ ذیل تھیں:

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جلبان (تھیلا وغیرہ) میں ہو۔

۴۔ مکے میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص مدینے جائے تو واپس کر دیا جائے، لیکن

اگر کوئی مسلمان مکے میں آجائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدے میں شریک ہو جائیں۔

اتفاق یہ کہ عین اس وقت جب معاہدہ لکھا جارہا تھا، سہیل کے صاحبزادے ابو جندل، جو اسلام قبول کر چکے تھے اور مکّہ میں کافروں نے انہیں قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ یہ دیکھ کر سہیل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے اس کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو۔"

حضورؐ نے فرمایا۔" ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا۔"

اس پر سہیل بولا۔" تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔"

حضورؐ نے چند دفعہ اصرار کیا کہ کسی طرح وہ ابو جندلؓ کو آپؐ ہی کے پاس رہنے دے مگر وہ شقی نہ مانا۔ ابو جندلؓ کو کافروں نے اتنا مارا تھا کہ اُن کے جسم پر نشان تھے۔ انہوں نے مجمعے کے سامنے اپنے زخم دکھائے اور فریاد کی:

" برادرانِ اسلام، کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو۔ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ کیا پھر مجھے کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو؟"

تمام مسلمان یہ دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ ان کے رنج و غم کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن حضورؐ ایفائے عہد کے خیال سے مجبور تھے۔ آپؐ نے ابو جندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

" ابو جندلؓ! صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا۔ صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔"

مگر یہ مجبوری اور بے بسی کا دور زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ ۶ھ میں تو صورتِ حالات یہ تھی کہ حضورؐ نہ مکّے میں کعبہ کی زیارت کو، داخل ہو سکتے تھے، نہ ایک مظلوم مسلمان

کو ظلم سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ مگر صرف چار سال بعد ۸ھ میں جب آپؐ نے حج کرنے کے لیے مکہ جانے کا ارادہ فرمایا تو اس وقت تک ۶ھ والے بااختیاروں کو اپنے اختیارات کھوئے ہوئے سوا دو سال گزر چکے تھے۔

۶ھ میں جب سہیل نمائندے کی حیثیت سے حضور صلعم سے بات کرنے آیا تھا تو شیخی اور اکڑ کا یہ عالم تھا کہ بات بات پر ٹوکتا تھا۔ اسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے پر بھی اعتراض تھا۔ حضورؐ کے نام مبارک کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر بھی اعتراض تھا۔ یہاں تک کہ دھمکی دی کہ اگر ہماری بات نہ مانی گئی تو ...."ہم کو صلح بھی منظور نہیں"۔ اور حضورؐ جاہلیت کے اس نمائندے کی ہر بات مانتے چلے گئے تھے۔

مگر دس ہجری میں جب عرفات کے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا شہرۂ آفاق خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو فرمایا:

"ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں"۔

کیونکہ اس مختصر سے وقفے کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اتنا سربلند کر دیا تھا کہ جاہلیت کے تمام دستور واقعی پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دونوں پاؤں کے نیچے آ چکے تھے۔۔

جب یہ سب حقائق تاریخی طور پر ثابت ہیں تو پھر یاس اور دل شکستگی کے لیے گنجائش کہاں سے نکلتی ہے۔

حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں اور دقتیں کتنی ہی شدید کیوں نہ ہوں، اور منزل کتنی ہی دُور کیوں نہ نظر آئے۔ ایک مومن کی ذمہ داری اتنی ہی ہے کہ خدا پر توکل کرتے ہوئے اپنی کوششوں کو جاری رکھے، اپنا فرض ادا کرتا رہے، اور اس حد تک ضرور جائے جہاں تک جانا ممکن ہو۔

محمد بن اسلم طوسی کو معتزلہ حکام نے آپ کی حق گوئی کے جرم میں قید کر رکھا تھا۔ جب جمعے کا دن آتا تو آپ غسل فرما کر کپڑے تبدیل کرتے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی آپ کو جامع مسجد تک پہنچنے نہیں دیگا مسجد کا قصد کر کے جیل کے دروازے کی طرف چل پڑتے۔ جب

آپ دروازہ پر پہنچتے تو داروغۂ جیل روک دیتا۔ پھر وہاں سے یہ کہتے ہوئے واپس آجاتے کہ "اے خدا میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے"۔

یعنی فریضۂ جمعہ ادا کرنے کے لیے جہاں تک پہنچنا میرے امکان میں تھا میں پہنچ گیا۔ اب آگے جیل سے باہر نکل جانا میرے امکان میں نہیں۔

نیکی ایک دریا ہے جو ازل سے بہہ رہا ہے اور ابد تک بہتا جائے گا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس دریائے بیکراں میں اپنے اپنے حصے کا قطرہ ڈالنا ہے، بس۔ پھر ہمارا یہ ننّا سا قطرہ کیا نتائج پیدا کرے گا اور کب کرے گا، اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ کس طرح یہ قطرہ ڈال دیا جائے۔

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغ ۔ (ہم پر تو بس پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے)

نتائج اللہ رب العالمین کے ذمّے ہیں —— اور کون نہیں جانتا کہ یہ نالے، یہ ندیاں، یہ دریا، یہ سمندر، یہ موسلا دھار بارشیں، یہ دھوم مچاتی آبشاریں، یہ پتھروں کے سینے پھاڑ کر نکل آنے والے چشمے، یہ پورے پورے شہروں کو بہالے جانے والے سیلاب۔ یہ سب قطرہ اور قطرہ اور قطرہ ہی کے مجموعے تو ہیں!

ایسے ہی کچھ آپ کی کوشش کچھ میری، کچھ دوسرے کی، کچھ تیسرے کی، کچھ چوتھے کی، کچھ پانچویں کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں چھوٹی چھوٹی کوششوں سے دنیا میں بڑے بڑے انقلاب برپا کر دیا کرتا ہے۔

ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ حق پر پورا ایمان ہو، مقصود صرف خدا کی خوشنودی ہو اور کوشش مسلسل جاری رہے ۔

دانائی

ایک دفعہ ایک شخص حضرت ابراہیم ابن ادھمؒ کی خدمت میں حاضر ہوُا اور عرض کیا کہ اے شیخ میں نے اپنے اوپر بہت ظلم کیا ہے۔ مجھ کو کوئی نصیحت کیجئے تاکہ اس پر عمل کروں۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے چھ خصلتوں کو قبول کرے تو اس کے بعد تو جو کچھ کرے گا وہ تجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب تو گناہ کرے تو خدا کی روزی نہ کھا۔

اس شخص نے کہا۔ "جب رازق وہی ہے تو پھر اور کہاں سے کھاؤں۔"

انہوں نے فرمایا کہ" یہ بات اچھی نہیں کہ آقا کی نافرمانی کرے اور پھر اس کی روزی کھائے"۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تو گناہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے ملک سے باہر نکل جا۔

اس نے کہا۔" مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سب کا مالک اللہ ہے۔ آخر میں کہاں جاسکتا ہوں"۔

فرمایا" یہ بات اچھی نہیں کہ توُ اسی کے ملک میں رہے پھر اسی کی نافرمانی کرے"۔

پھر اس سے کہا۔

"تیسری بات یہ ہے کہ جب توُ گناہ کرنا چاہے تو ایسی جگہ کر جہاں وہ تجھے نہ دیکھے"۔

اس نے کہا۔" وہ تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور دل کی پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے۔ ایسی جگہ کونسی ہے جہاں وہ موجود نہ ہو"۔

فرمایا۔" یہ بات اچھی نہیں ہے کہ توُ اس کو حاضر و ناظر بھی جانے اور پھر بے دھڑک ہو کر گناہ بھی کرے"۔

پھر فرمایا" چوتھی بات یہ ہے کہ جب ملک الموت تیری روح قبض کرنے آئے

تو اس سے کہہ دے کہ مجھے توبہ کرنے کی مہلت دے"۔

اُس نے کہا " بھلا وہ میری بات کیوں قبول کرے گا۔ موت کا وقت تو مقرر ہے۔"

فرمایا۔" اگر تم کو یہ اختیار نہیں کہ توبہ کے لیے مہلت حاصل کر لو، تو اس وقت کو غنیمت کیوں نہیں سمجھتے اور ملک الموت کے آنے سے پہلے توبہ کیوں نہیں کر لیتے۔"

پھر فرمایا۔" پانچویں بات یہ ہے کہ جب تیرے پاس منکر نکیر آئیں تو اُن کو اپنے پاس سے دُور کر دے"۔

اُس نے کہا " بھلا مجھ میں اتنی طاقت کہاں ؟ "

فرمایا۔" اگر یہ طاقت نہیں تو ان کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر"۔

پھر فرمایا۔" چھٹی بات یہ ہے کہ قیامت کے دن جب حکم ہو گا کہ گنہ گاروں کو دوزخ میں لے جاؤ، اس وقت کہنا کہ میں نہیں جاتا۔"

اس نے کہا۔" میرے کہنے کا کیا ہے۔ وہ مجھے زبردستی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔"

فرمایا۔" اگر یہ حال ہے تو پھر گناہ سے باز کیوں نہیں آتے"۔

واضح رہے کہ جو کچھ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کو اس شخص سے کہنا تھا، وہ صرف یہ تھا کہ

تو خدا کی روزی کھاتا ہے۔

اور اس کے ملک میں رہتا ہے۔

اور وہ حاضر و ناظر ہونے کے باعث تیرے گناہوں کو دیکھ رہا ہے۔

اور ایک دن تجھے موت کا سامنا کرنا ہے جو اس طرح اچانک آئے گی کہ تجھے توبہ کی مہلت نہیں دے گی۔

اور مرنے کے بعد تجھے قبر میں منکر نکیر کے سوالوں کا جواب بھی دینا ہے۔

اور اگر تو گناہوں سے باز نہ آیا تو قیامت کے دن تجھے دوزخ میں جانا پڑے گا۔

لہٰذا ان تمام حقائق کے پیشِ نظر تو موت کے آنے سے پہلے پہلے توبہ کر لے تاکہ تو

قبر اور دوزخ کے عذاب سے بچ جائے۔

مگر اس بات کو اس طرح سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے انہوں نے اسے سوال وجواب کا انداز دے کر اتنی دانائی اور عمدگی سے کہا کہ سننے والے کا دل بے حد متاثر ہوا۔ وہ شدتِ تاثر سے زار زار رونے لگا۔ سچے دل سے توبہ کی اور آخر دم تک اس توبہ پہ قائم رہا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ تبلیغ کرتے وقت اس چیز کا دھیان رکھنا بے حد مفید ہوتا ہے کہ بات کو حتی الامکان اس دانائی اور عمدگی سے کہا جائے کہ سننے والا زیادہ سے زیادہ متاثر ہو۔

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلَاغ ۔ (ہم پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے) کا مطلب یہ ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ خدا کے پیغام کو بس پہنچا دینا چاہیے، چاہے جیسے تیسے ہی پہنچائیں۔ تبلیغ اسلام کو جیسے تیسے پہنچا دینے کا نام نہیں بلکہ اس بات کا نام ہے کہ انسان اپنے جسم و جان اور سمجھ بوجھ کی تمام قوتوں کو کام میں لا کر خدا کے پیغام کو بہتر سے بہتر اور عمدہ سے عمدہ انداز میں پہنچائے اور اس کے بعد نتائج کے لیے خدا پہ بھروسہ رکھے، جلدی نہ مچائے، نہ دل شکستگی کا شکار ہو۔ انبیائے کرامؑ اور صالحین عظامؒ کے تبلیغ کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ وہ دانائی اور سمجھ داری سے تبلیغ کرتے تھے، بے سمجھی سے نہیں۔

اگر ہم خدا کے پیغام کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے وقت بے سمجھی کا ثبوت دیں گے، یعنی عالم جاہل، عقلمند بے عقل، خواہشمند متنفر، عورت مرد، بالغ نابالغ، خوشحال غریب، غمگین مسرور، مصیبت زدہ خوش نصیب، راسخ العقیدہ متشکک سب پہ ایک ہی لگے بندھے طریقے سے تبلیغ کرنے کی کوشش کریں گے۔

یا لوگوں کو نسبتاً غیر اہم مسائل میں الجھا دیں گے اور اہم کو نظر انداز کیے رہیں گے۔

یا دین کو بہت مشکل بنا کر پیش کریں گے اور لوگوں کو ڈرا ڈرا کر ناامید کر دیں گے۔

یا مخاطبین کو غلط انداز میں یہ تاثر دیں گے کہ دین کا دنیاوی خوش حالی سے کوئی

تعلق نہیں۔

یا وقت بے وقت اور موقع بے موقع بات کریں گے اور اتنی بار کریں گے کہ لوگ عاجز آجائیں گے۔

یا نرمی اور حسنِ بیان سے کام لینے کے بجائے درشتگی اور کرختگی اختیار کریں گے۔

اگر ہم ایسے غلط طریقے سے تبلیغ کریں گے تو ہمیں اس بات کی زیادہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ لوگ ہماری بات سے متاثر ہوں گے۔

داعی کا کام صرف یہی نہیں کہ صرف تبلیغ کردے بلکہ تبلیغ کے ساتھ ایک چیز حکمتِ تبلیغ بھی ہے یعنی دانائی اور سمجھداری سے تبلیغ کرنا۔ داعی کے لیے اس دانائی اور سمجھ داری سے کام لینا بہت ضروری ہے۔

سورہ النحل، آیت ۱۲۵ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ	"اے نبی، اپنے رب کے راستے کی
بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ	طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ	کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے
اَحْسَنُ۔	طریق پر جو بہترین ہو۔"

یہاں دعوت دینے کے ساتھ دانائی اور نصیحت کا ذکر ہے اور نصیحت کے متعلق واضح کیا گیا ہے کہ وہ عمدہ ہو اور مباحثہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مگر ساتھ ہی تلقین کر دی گئی ہے کہ ایسے طریق سے ہو جو بہترین ہو۔

لفظ دانائی کے ٹھیک ٹھیک معنی معین کرنا اور تفصیل بتانا کہ اس میں کیا کیا شامل ہے بہت مشکل ہے۔ مجملاً چند احتیاطیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں، جن کے متعلق توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ داعی کی تبلیغی کوششوں کو مؤثر بنانے میں بہت امداد دیں گی۔

مخاطبین

پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ داعی جن لوگوں کو مخاطب کرتا ہے وہ سب ایک ہی قسم

کے لوگ نہیں ہُوا کرتے بلکہ ان کا بے شمار اقسام سے تعلق ہوتا ہے اور ہر قسم کے لیے ان کے مخصوص حالات، صلاحیتوں اور میلانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرنا ضروری ہے جس سے وہ متاثر ہو سکیں۔ مثلاً جو لوگ بہت عقلیت پسند ہیں اور ہر بات کی کنہ نکالتے ہیں، ان کے ساتھ بات کرتے وقت مناسب طریقے سے استدلال کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر جو دین سے محبت رکھتے ہیں اور صرف نہ جاننے کے باعث غلط طرزِ عمل اختیار کیے ہوتے ہیں، ان کے آگے فلسفہ چھانٹنے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مؤثر زبان میں دین کے احکام اور ان کے تقاضے پیش کر دینے کافی ہوتے ہیں۔

اگر اس ترتیب کو الٹ دیا جائے تو خاطر خواہ نتائج نکلنے کے امکان بہت کم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اوّل الذکر قسم کے لوگ جو اسلامی عبادات کا پورا فلسفہ سمجھے بغیر نماز پڑھنے کا خیال بھی نہیں کر سکتے، اُن کو نماز کے مسائل بتا نالا حاصل ہے اور آخر الذکر قسم کے لوگ جو خود ہی دینی احکام معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں، اُن کے آگے عالمانہ استدلال کر کر کے سوائے اس کے کہ انسان انہیں زِچ کرے اور اُن کا اور اپنا، دونوں کا وقت ضائع کرے، اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

ایسے ہی جب مخاطب کوئی زیادہ پڑھا لکھا انسان ہو، اس وقت زبان، پیرایۂ بیان اور طرزِ استدلال ایسا ہونا چاہیے جو اس کے منجھے ہوئے دماغ کو اپیل کر سکے۔ اور جب مخاطب کوئی کم پڑھا لکھا، سیدھا سادا انسان ہو تو اس کے لیے آسان زبان، سادہ طرزِ بیان اور ایسی مثالوں کی ضرورت ہے جو اس کے روز مرّہ کے مشاہدے میں آتی ہوں اور جن کو سمجھنے کے لیے زیادہ تخیّل سے کام نہ لینا پڑتا ہو۔

ایک مہذب، پڑھی لکھی اور بہت زیادہ جذبۂ تبلیغ رکھنے والی خاتون ایک جگہ قرآن پاک کا درس دے رہی تھیں۔ حاضرات میں تعلیم یافتہ بھی تھیں، مگر وہ چند ایک ہی تھیں۔ غالب اکثریت معمولی نوشت و خواند رکھنے والی عام گھردار خواتین کی تھی۔ اور کچھ دیہاتی عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ جہاں تک شوق اور احترام کا تعلق تھا وہ تو سبھی کے چہروں پر موجود تھا۔ مگر چند ایک کے سوا باقی سب کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُن کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیونکہ

درس دینے والی خاتون جو زبان اور اندازِ بیان اختیار کیے ہوئے تھیں وہ اس گروہ کے فہم سے بالا تھا۔ جب درس ختم ہُوا تو خواتین کی اکثریت سبحان اللہ سبحان اللہ کرنے لگی اور درس کی بہت کچھ تعریف کی. گویا کہ وہ سب کچھ سمجھ رہی تھیں۔ مگر ایک دبنگ قسم کی نیم دیہاتی نیم شہری عورت بڑے عجیب انداز سے ہنس پڑی اور بڑے بے سلیقہ پن سے کہا:

"ویسے پلّے کچھ نہیں پڑا۔"

پلّے تو اکثریت کے کچھ نہیں پڑا تھا مگر جہاں باقی سب تکلف میں رہیں وہاں ایک نے حقیقت کا اظہار کر دیا۔ اب ظاہر ہے کہ درس دینے والی خاتون تو انتہائی نیک نیتی سے حاضرات کو خدا کا کلام سمجھانے کی کوشش میں تھیں مگر محض اس لیے کہ انہوں نے سُننے والیوں کے علمی پائے کو مدِنظر نہ رکھا اُن کی محنت بہت حد تک بے اثر رہی۔

ایسے ہی پاکستان بننے کے بعد ایک زنانہ تعلیمی ادارے میں پہلی دفعہ ایک مسلمان پرنسپل کا تقرر ہوُا۔ انہوں نے ایک "عالم" کو معین کیا کہ ہر ہفتے آ کر طالبات کو دین کے بارے میں کچھ بتایا کریں مگر ان "عالم" نے طالبات کو دین سے متعارف کرانے کے بجائے محض جہنم سے متعارف کرانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ بار بار انہیں دوزخ کی سزاؤں ہی کا ذکر سناتے اور انہیں دھمکاتے کہ جب تمہیں فرشتوں سے مار پڑے گی۔

"تو پھر تمہیں سب پتہ چل جائے گا۔"

ظاہر ہے کہ یہ طرزِ تبلیغ اس ماحول میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ایسے ہی جو طرزِ عمل باہر کے لوگوں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ قریبی رشتہ داروں میں بھی کامیاب ہو جائے۔ عام خیال تو یہ ہے کہ قریبی ماحول جلد متاثر ہوتا ہے بہ نسبت دور کے لوگوں کے مگر دعوتِ دین کے معاملے میں لبا اوقات یہ ترتیب الٹ جاتی ہے اور باہر کے لوگ جلد اثر قبول کرتے ہیں۔ بہ نسبت قریبی رشتہ داروں کے۔ اس کی وجہ لبا اوقات یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی غیر آپ کی بات سنتا ہے تو وہ صرف اس بات پہ غور کرتا ہے۔ اُس بات کو آپ کے ماضی اور حال سے جوڑتا نہیں۔ مگر جب

آپ کسی قریبی رشتے دار کو راہِ حق دکھانے کی کوشش کریں تو کیا عجب کہ ٹھیک اسی وقت اسے یاد آجائے کہ ماضی میں آپ نے اس کے ساتھ کوئی حقیقی یا وہمی بدسلوکی روا رکھی تھی یا اب بھی آپ کا طرزِ عمل اس کی توقعات کے مطابق نہیں ــــ لہٰذا وہ آپ کی کہی ہوئی بات کو متعصب کانوں سے سُنے گا۔ اس لیے وہ بات اس کے لیے اپنا بہت سا اثر کھو بیٹھے گی۔

قریبی ماحول میں تبلیغ کرنے کے جو اصول قاعدے بتائے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ یہاں بات کم کی جائے اور حسنِ سلوک پر زیادہ زور دیا جائے۔ اور چونکہ قریبی ماحول ہونے کے باعث یہاں ملنے ملانے اور گفتگو کرنے کے مواقع زیادہ ہوں گے اس لیے اُن سے بکثرت شفقت و محبت اور عزت و احترام کا برتاؤ کرتے ہوئے اور ان کے حقوق کما حقہٗ ادا کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً جو بات کی جائے گی اس کے مؤثر ہونے کا امکان زیادہ ہے بہ نسبت اس کے کہ حسنِ سلوک اور ادائیگی حقوق کی طرف تو توجہ نہ دی جائے اور بار بار انہیں لمبے لمبے لیکچر پلانے کا بندوبست جاری رہے۔

اسی طرح سمجھ دار اور انصاف پسند مخالفین اور ضدی اور ہٹ دھرم مخالفین دونوں کے لیے ایک ہی جیسا طریقۂ تبلیغ اختیار کرنا بھی مضر ثابت ہوتا ہے جو شخص اپنے مخصوص ماحول یا کسی اور مؤثر کے باعث غلط نظریات کو ذہن نشین کر چکا ہے۔ مگر ہے سمجھدار اور انصاف پسند، کوئی حرج نہیں۔ اگر داعی مناسب طور پر بار بار نئے نئے طریقے اختیار کر کر کے اور پیرایۂ بیان بدل بدل کر اسے سمجھانے کی کوشش جاری رکھے۔ لیکن اگر مخاطب کوئی ضدی اور ہٹ دھرم شخص ہو اور صرف دل کی دشمنی، بغض اور تکبّر کے باعث بات کو نہ مان رہا ہو تو پھر زیادہ پیچھا کر کے اسے اور زیادہ ہٹ دھرم اور متکبّر بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی صورت میں مناسب حد تک تبلیغ کر کے اور حجت تمام کر کے ایک طرف ہو جانا زیادہ مناسب ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن پاک میں کئی جگہ ہدایات آئی ہیں۔ انہیں کی پیروی لازم ہے۔ سورہ القصص، آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ نے بعض حق پسند لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اور جب انہوں نے (جاہل مخالفینِ دین کی) بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"

سورۃ الفرقان، آیت ۶۳ میں بیان ہوا ہے:

"رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔"

سورۃ الاعراف، آیت ۱۹۹ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

(اے نبی) نرمی اور درگذر کا طریقہ اختیار کرو اور نیکی کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔"

ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو لفظ جاہل استعمال کیا ہے اس کا مطلب ہے وہ شخص جو جہالت پر اتر آئے، غلط بات پر اڑ جائے، شرافت اور نیکی کے مقابلے میں بدتمیزیاں کرنے لگے، اور "سلام" کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان جاہلوں سے الجھنے کے بجائے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

اس قسم کے لوگوں سے نہ الجھنے کی جو تلقین کی گئی ہے، وہ اس لیے کہ اس وقت ان کی ذہنی اور قلبی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ بالفاظِ قرآنِ پاک:

"ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔" (الاعراف، آیت ۱۷۹)

چنانچہ ایسے لوگوں پر مناسب حد تک تبلیغ کرنے کے بعد وہی طرزِ عمل ٹھیک ہے جو سورہ الزمر، آیات ۳۹، ۴۰ میں بیان ہوا:-

"(اے نبیؐ) ان سے کہہ دو کہ اے میری قوم کے لوگو، تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور

کسے وہ سزا ملتی ہے جو کبھی ٹلنے والی نہیں ۔"

اسی طرح اگر مخاطبین سرکاری ملازم، معلم، ڈاکٹر، انجنیئر یا اور کوئی دوسرے ایسے لوگ ہوں، جن کا پیشہ بارہ بارہ، چودہ چودہ، سولہ سولہ، اٹھارہ اٹھارہ سال کی تعلیم پر مبنی ہوتا ہے، وہ جس زبان سے متاثر ہوں گے، وہی زبان تاجروں، صنعت پیشہ لوگوں اور دوسرے ایسے اشخاص کے لیے مفید نہیں ہوسکتی، جن کو اپنے پیشوں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اسی طرح شہروں میں زبانی دعوت دینے کے علاوہ تبلیغ کے لیے جو دوسرے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کتابیں شائع کی جاتی ہیں، اخبارات اور رسائل جاری کیے جاتے ہیں۔ پمفلٹ چھاپے جاتے ہیں۔ یہ دیہات میں بہت حد تک بے کار ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کی غالب اکثریت نوشت و خواند سے واقف نہیں ہوتی۔ انہیں متاثر کرنے کی خاطر تو ضروری ہے کہ انسان ان کے مخصوص مسائل کو حل کرنے کے لیے ان کی عملی امداد کرے۔ ان میں گھلے ملے تاکہ ان کی وحشت دور ہو، اور اُن پر زبانی تبلیغ کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر جس اصول کا دھیان رکھنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ داعی دیکھ لے کہ اس کے مخاطب کون لوگ ہیں اور وہ کس قسم کی زبان، پیرایۂ بیان اور طرزِ عمل سے متاثر ہوں گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے :

"لوگوں سے وہی حدیث بیان کرو جسے وہ سمجھ سکیں۔ کیا تم اس بات کو اچھا سمجھتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب کی جائے "۔ (بخاری)

لغات الحدیث، جلد پنجم، صفحہ ۳۵ پر اس حدیث کی تشریح یوں بیان کی گئی ہے :

"کیا تم (لوگوں کو ایسی باتیں سنا کر جو ان کی سمجھ سے باہر ہوں) یہ چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور اس کے پیغمبر کو جھٹلائیں (یعنی عوام کے سامنے دین کے باریک مسائل نہ بیان کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں جھٹلائیں اور کافر بن جائیں بلکہ ہر ایک سے اس کی عقل اور فہم کے مطابق گفتگو کرنی چاہیے)۔"

لوگوں کی قوتِ فہم اور سمجھ بوجھ کے علاوہ ان کے مخصوص حالات کو پیشِ نظر

رکھنا بھی ضروری ہے. ہر انسان کے لیے اپنے ذاتی مسائل ہی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں. اور جس طرزِ زندگی یا ضابطۂ حیات میں ان کا حل موجود ہو، وہی انہیں زیادہ اپیل کرتا ہے۔ اسلام کے نظامِ حیات میں تو زندگی کی ہر مشکل کا حل موجود ہے۔ تاہم بات کرتے وقت اس پہلو سے آغاز کرنا جس میں مخاطب کے مسائل کا حل ہو، زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر مخاطب عمر رسیدہ ہے اور اپنی اولاد میں سے کسی کے اخلاقی خرابی میں مبتلا ہو جانے کے باعث فکرمند ہے تو اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے اسلام کی ان چیزوں سے ابتدا کرنا جو اخلاق کو بربادی سے بچانے والی ہیں زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتا ہے. ایسے ہی جو عورت خاوند کی بدسلوکی سے نالاں ہو، اس کو اسلام کے وہ احکام زیادہ جلدی متاثر کریں گے جن میں عورت کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔

اسی طرح جو شخص معاشرے کی رشوت خوری، جنبہ داری اور غلط قسم کی سفارشوں کے باعث اپنے جائز حق سے محروم رہا ہو، اس کے لیے اسلام کے امانت و دیانت اور انصاف و فرض شناسی سے تعلق رکھنے والے احکام میں زیادہ کشش ہو گی۔ وَقِس عَلیٰ ھٰذا۔

یہاں ایک قابلِ توجہ امر یہ بھی ہے کہ انسانی معاشرہ اتنی مختلف اقسام کے لوگوں پہ مشتمل ہوتا ہے کہ ایک داعی کا ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ یکساں طور پہ کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔ اس لیے مناسب تر یہ ہے کہ جو داعی اپنے مخصوص علم اور تجربے کی بنا پہ جس مخصوص ماحول میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہو وہ اسی ماحول کو زیادہ توجہ کا مرکز بنائے۔ جو لوگ خود تعلیم یافتہ ہوں اور زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں میں رہے ہوں اُن کا اس ماحول میں کام کرنا زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے بہ نسبت ان داعیوں کے جو اس ماحول میں نہ رہے ہوں اور نہ زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کے نظریات اور ان کی مخصوص نفسیات سے واقف نہ ہوں۔

ایسے ہی عام نیم خواندہ یا ناخواندہ لوگوں میں تبلیغ کرنے کے لیے اُن مبلغوں کی ضرورت ہے جو ان لوگوں کی قوتِ فہم، معاشرت کے طور طریقوں، باہمی انسانی تعلقات کی پیچیدگیوں اور مالی مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ کوئی ضروری نہیں کہ جو انسان زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ماحول میں کامیاب ہوا ہو وہ یہاں بھی کامیاب ہو جائے۔ اس ماحول میں تبلیغ کرنے کے

لیے بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی نہیں بلکہ بہت زیادہ دور اندیش، معاملہ فہم اور سمجھدار ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نظری حد تک پہلے ہی خدا پرست ہوتے ہیں، مگر عملی تقاضے پورے نہیں کرتے۔ اس لیے ان کی عقلوں کو اپیل کرنے سے زیادہ ان کے دلوں کو متاثر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی طرح دیہات میں کامیاب ہونے کے لیے اُن لوگوں کی ضرورت ہے جو دیہاتی زندگی کے مخصوص طور طریقوں مسائل اور پیچیدگیوں سے واقف ہوں اور ان کے ساتھ انہیں کی زبان اور طرز بیان میں بات کرسکیں۔ ہمارے دیہات میں عموماً افلاس اور اکھڑپن کی زیادتی اور علم اور حلم کی کمی ہے۔ وہ پڑھے لکھے لوگوں سے ویسے بھی وحشت زدہ سے رہتے ہیں۔ انہیں متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ان کے ساتھ گُھل مِل کر بظاہر ان جیسا بن کر رہے تاکہ وہ اجنبیت محسوس نہ کریں۔ ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد ان سے جو بات کی جائے گی اسے وہ سیدھے سادے لوگ بہت جلد مانیں گے، بشرطیکہ بات اس انداز میں کی جائے کہ ان کی سمجھ میں آجائے۔

دعوتِ دین کے لیے ذریعہ کیا اختیار کیا جائے۔ اس معاملے میں بھی اپنی مخصوص صلاحیت کو دیکھ لینا چاہیے۔ بعض لوگ لکھنے کا کام بہتر طور پر کرسکتے ہیں مگر مجمعوں میں بول نہیں سکتے اور بعض میں قوتِ تقریر خوب ہوتی ہے مگر لکھنا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی بعض لوگ طلباء اور طالبات کو دینی تعلیم دینے میں کامیاب ثابت ہو جاتے ہیں مگر عوام کو متاثر نہیں کرسکتے اور بعض عوام کو خوب متاثر کرلیتے ہیں۔ مگر درس و تدریس ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اہلِ قلم کتابیں لکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں مگر صحافی نہیں بن سکتے اور بعض صحافی کامیاب ثابت ہوتے ہیں مگر کتابیں نہیں لکھ سکتے! اب جس شخص میں جو صلاحیت زیادہ ہو اُسے اُسی سے زیادہ کام لینا چاہیئے۔ اسی طرح وہ زیادہ بہتر طور پر تبلیغ کرسکے گا۔

مختصر یہ کہ دانائی کے ساتھ دعوت دین کا کام کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ انسان خود اپنی صلاحیتوں اور مخاطبین کی قوت فہم اور مخصوص حالات کو اچھی طرح پیشِ نظر رکھ کر مناسب حال

طریقۂ تبلیغ اور ذریعۂ تبلیغ اختیار کرے۔

دین کا تصور

داعی کے لیے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ لوگوں کو دین سے متعارف کراتے وقت وہ دین کو چند رسوم کا مجموعہ بنا کر پیش نہ کرے بلکہ اسے ایک پورے نظامِ زندگی کی حیثیت سے متعارف کرائے۔ اوپر جو بیان ہوا ہے کہ مخاطب کے مخصوص مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آغاز ایسی باتوں سے کیا جائے جن میں اس کی مشکلات کا حل ہو۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ دعوت کا آغاز اس طرح ہونا چاہیے کہ مخاطب دین میں دلچسپی لینے لگے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس انسان کو دین کا صرف وہی رخ دکھایا جاتا رہے جس میں اس کی مشکلات کا حل ہو بلکہ دین کو بحیثیت مجموعی پیش کرنا چاہیے۔ مسلمانوں میں ایک یہ خرابی بھی آچکی ہے کہ مختلف مسلمان اقوام بلکہ ایک ہی ملک کے اندر مختلف مسلمان گروہ اپنی اپنی پسند کے مطابق دین کے خاص خاص حصوں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور باقی حصوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ایک نومسلم یورپین پاکستان آیا اور اس نے ایک تعلیمی ادارے میں تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں اس نے خصوصی طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ میں نے کئی مسلمان ممالک میں پھر کر یہ دیکھا ہے کہ ہر علاقے کے لوگ دین کے کسی خاص حصے پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اسی کو پورا دین سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی ملک صرف نماز اور روزے ہی کو دین سمجھتا ہے، کسی کے ہاں طہارت اور پاکیزگی ہی اسلام ہے۔ کوئی فقہی ڈھانچے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ کہیں مرد و زن کے باہمی حجاب کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بعض علاقوں میں حج کرنا اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ سبھی احکام ضروری ہیں۔ مگر جب ہم ان میں سے کسی ایک ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں تو پھر لازماً دوسروں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور دینی زندگی میں توازن قائم نہیں رہتا۔ خود اپنے ملک میں بھی یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے کہ مختلف خاندان اور مختلف افراد دین کی کسی ایک یا چند چیزوں پر سارا زور صرف کر دیتے ہیں اور باقی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

دو ایسے خاندانوں سے ملنے کا اتفاق ہؤا جو اپنی اپنی جگہ دیندار ہی تھے۔ ان میں سے ایک خاندان میں پردے پر اس قدر زور دیا جاتا تھا کہ ایک آٹھ سال کی بچی کو بھی مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ برقع اوڑھے۔ مگر اسی خاندان میں فوٹو گرافی بطور مشغلہ کے عام تھی۔

دوسرے خاندان میں خاتونِ خانہ نے بغیر کسی مجبوری کے پردہ ترک کر دیا، مگر وہ فوٹو گرافی کو اسی قدر خلافِ اسلام سمجھتی تھیں کہ ایک واقف کار کے گھر میں ان کے میاں اور ان کے دوستوں کی تصویریں دیکھ کر انہوں نے اعتراض کیا کہ آخر گھر میں ایسی چیزیں کیوں رکھی جاتی ہیں جن کے باعث رحمت کے فرشتے گھر میں نہ آئیں۔

ان مثالوں کو بیان کرنے سے مقصود صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے ذوق اور میلانِ طبع کے مطابق دین کے کسی ایک حکم کو زیادہ ضروری اور دوسرے کو کم ضروری قرار دے لیتے ہیں یا شاید یوں کہنا چاہیئے کہ دین کے کسی ایک یا چند احکام ہی کو مکمل دین سمجھ لیتے ہیں اور دوسرے احکام کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں گویا ان کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

ایک معزز اور دیندار خاتون اپنے بیٹے کے ہاں گئیں اور وہاں جب انہوں نے دیکھا کہ گھر کا جمعدار غسل خانے میں پانی کی بالٹی کو دھو رہا ہے تو انہوں نے سر پیٹ لیا اور اعلان کر دیا کہ اس گھر میں مسلمانی سرے سے ختم ہی ہو چکی ہے کہ طہارت اور پاکیزگی کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہا..... پھر یہی خاتون تھیں کہ گھنٹوں بیٹھی لوگوں کی غیبتیں کرتی رہتی تھیں اور اس وقت ان کی مسلمانی پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔

بہت سے لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں جو نماز اور روزے کے پابند ہوتے ہیں مگر زکوٰۃ کی ادائیگی سے اس طرح پہلو بچاتے ہیں گویا زکوٰۃ اسلامی عبادات میں رکھی ہی نہیں گئی ہے۔

بعض لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے پیشے کے معاملے میں انتہائی دیانتدار ہوتے ہیں اور ایک سوئی بھی رشوت میں لینے کے روادار نہیں ہوتے۔ مگر یہی لوگ جب غلط قسم کی سفارشیں مان کر حقداروں کو اُن کے حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ تو اُن کے ضمیر پر ذرا بھی بوجھ نہیں ہوتا کہ ہم نے کوئی خلافِ اسلام حرکت کی ہے۔

اب جب ہر گروہ اپنے اپنے مخصوص میلانات کے مطابق دین کے بعض مخصوص احکام

ہی کو پورا دین قرار دے گا، تو پھر ظاہر ہے کہ دینداری کی بے شمار اقسام بن جائیں گی۔ جیسے کہ عملاً اس وقت ہو رہا ہے۔ بعض نئی قسم کے دیندار ہیں بعض بالکل پرانی قسم کے، اور ان دونوں قسموں کے درمیان دینداری کی اَن گنت اقسام اور ہیں اور ان میں سے ہر قسم سے تعلق رکھنے والے دیندار صرف اپنے آپ ہی کو دین کے صحیح نمائندے سمجھتے ہیں، اور دوسری قسم سے تعلق رکھنے والے دینداروں پہ اُسی طرح معترض ہوتے ہیں جس طرح دین سے بے پروا لوگوں پہ۔ لہٰذا اوقات یہ دردانگیز منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ یہ دیندار لوگ آپس ہی میں ٹکراتے رہتے ہیں اور دین سے بے پروا لوگوں یا غیر مسلموں کو اسلام کی طرف بلانے کا کوئی تصور ان کے ذہن میں موجود نہیں ہوتا۔

لہٰذا ایک سمجھدار داعی کو اس غلطی سے بچنا چاہیئے کہ دعوت دیتے وقت وہ بعض مخصوص احکام ہی کی طرف دعوت دیتا رہے اور دین کو بحیثیت مجموعی پیش نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ آغاز چند باتوں ہی سے کیا جائے گا تاہم شروع سے یہ سمجھانا ضروری ہے کہ دین پوری زندگی میں خدا کی اطاعت کرنے کا نام ہے۔ چند رسوم ادا کر لینے یا چند طریقوں کو اپنا لینے کا نام نہیں۔

تدریج

یہاں تصویر کے دوسرے رخ کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی سمجھ دار داعی بھی یہ غلطی نہیں کرے گا کہ اپنے مخاطبین پر فوراً ہی پورے کا پورا دین ٹھونسنے کی کوشش کرے۔ پورے دین کو ایک دم لاد ڈالنے کی صورت میں اس بات کا خطرہ زیادہ ہے کہ لوگ تھوڑے کو بھی قبول نہ کر سکیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود بھی اس بات پر عمل کیا ہے، اور ساتھیوں کو بھی تلقین کی ہے کہ دین کو تدریج سے پیش کیا جائے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ انہیں (یعنی اہلِ یمن کو) اس بات کی دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔

پھر اگر وہ اس بات میں تیری اطاعت کر لیں تو انہیں بتا دینا کہ خدا نے ان پر ہر صبح وشام میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔

پس اگر وہ اس میں (بھی) تیری اطاعت کر لیں تو انہیں بتا دینا کہ خدا نے تمہارے مالوں پر فرض کی ہے جو تمہارے مالداروں سے لی جائے گی اور تمہارے محتاجوں کو دی جائے گی۔

(بخاری، مسلم)

مخاطبین کو یہ بات تو شروع ہی سے سمجھا دی جائے کہ دین پوری زندگی کا نام ہے۔ مگر دین کے احکام بتاتے وقت انہیں اسی تدریج سے بتایا جائے جو خدا اور اس کے رسولؐ نے اختیار کی۔ یعنی دین کے اصولی احکام پہلے بتائے جائیں اور فروعات کو بعد کے لیے اٹھا رکھا جائے اور اصولی احکام بتاتے وقت بھی ایک دم بہت سی باتیں نہ بتا دی جائیں بلکہ ان کی صلاحیت کو دیکھ کر ایک وقت میں اتنی ہی بات کی جائے جسے وہ ہضم کر سکیں۔ حضورؐ کے تعلیمی ارشادات کو دیکھیے۔ کہیں آپؐ نے ایک نصیحت کی ہے کہیں دو۔ کہیں تین یا چار یا پانچ یا سات یا نو، مگر ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس سے یہ پتہ چلے کہ حضورؐ نے ایک ہی سانس میں بیسیوں نصیحتیں کر ڈالی ہوں۔

تبلیغ کرتے وقت بنیادی باتوں کو پیش کرنا اور فروعی مسائل سے حتی الامکان بچنا اس لیے ضروری ہے کہ بنیادی مسائل پیش کیے جائیں گے تو لوگ باہم متفق ہوں گے اور فروعی مسائل پر زور دیا جائے گا تو ان میں چونکہ علمائے امت کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ شروع ہی میں ان پر زور دینے سے لوگوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ لہٰذا ان پر بحثیں کرنے سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ ایک سمجھ دار داعی کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو دین کے اصولوں کی طرف بلائے۔ فروعی معاملات میں ان کا جو بھی اپنا اپنا طرز عمل ہو اس سے نہ الجھے۔ ورنہ وہ دین کی خدمت کرنے کے بجائے فتنوں کو ہوا دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔

سب سے پہلے جن چیزوں کی طرف بلانا ضروری ہے۔ وہ وہی دین کی بنیادی باتیں ہیں جن پر عمل کر لینے سے زندگی کے باقی معاملات خود ہی سدھرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور قدرت کاملہ پہ ایمان، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین، دین کی حقانیت

کا احساس، آخرت کے مواخذے کا خوف، اسلامی عبادات کی پابندی، تزکیۂ نفس کا شوق، اسلامی اخوت اور اسلامی مساوات پر عمل، فرض شناسی، امانت و دیانت، حیاو پاکبازی اور حصولِ علم کا شوق۔ یہ دین کی وہ اساسی چیزیں ہیں جنہیں پہلے متعارف کرانا چاہیے۔ انہیں کی بنیادوں پر وہ سیرتیں تعمیر ہوں گی جن سے توقع رکھی جا سکے گی کہ وہ موجودہ مادہ پرست دنیا کو خدا کا پیغام پہنچا کر اپنے خَیْرَ اُمَّۃٍ (بہترین امت) ہونے کا ثبوت دے سکیں۔

یہ سخت رنج کا مقام ہے کہ اس وقت جو لوگ تبلیغ دین کا کام شروع کرتے بھی ہیں۔ ان میں سے بھی بہت سے لوگوں کی سرگرمیوں کا مآل یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو فروعی مسائل میں الجھا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس وقت جب عالم اسلام جان لیوا مشکلات میں مبتلا ہے اور کہیں دشمنان دین اور کہیں خود دین سے بے پروا مسلمان، اسلام کی جڑیں کاٹنے کی فکر میں غرق ہیں ایسے دینداروں کی کمی نہیں جو اسی بات پر سارا زور صرف کر دیتے ہیں کہ آمین بلند آواز میں کہنی ہے یا پست میں، رفع یدین کرنا ہے یا نہیں کرنا اور رکعات تراویح آٹھ ہیں یا بیس، اور رسولِ خدا ؐ بشر تھے یا مافوق البشر۔

سوال یہ ہے کہ جب ملت کی غالب اکثریت سرے سے نماز ہی چھوڑ بیٹھی ہو اور ان میں سے ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو پنج وقتہ نماز کو فرض ہی نہ سمجھتے ہوں، اس وقت آمین بالجہر یا رفع یدین کے مسائل پر مناظروں کے دنگل جمانے کہاں تک برمحل ہو سکتے ہیں اور جب لوگ فرض نماز ہی سے بھاگ نکلے ہوں، اس وقت ایک نفل نماز کی رکعات کی تعداد پر جھگڑے کھڑے کرنے کہاں کی عقلمندی ہے۔

راہِ حق کے داعیوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے طریقۂ تبلیغ میں اس بات کی طرف خصوصی توجہ رکھیں کہ لوگوں کو دین کی بنیادوں سے واقف کرایا جائے نہ کہ فروعات سے، اس سلسلے میں ان نیکوکار ہستیوں کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنا بھی بہت مفید ہوگا جنہوں نے پوری پوری زندگیاں تبلیغ کی راہ میں صرف کر دیں اور ایک دنیا کو راہِ ہدایت دکھائی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے ایک سوانح نگار

ابوسلمان شاہجہان پوری حضرت کے طریقۂ تبلیغ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"حضرت خواجہ صاحب سب سے پہلے لوگوں کو ان عالمگیر سچائیوں کی طرف مائل کرتے تھے۔ انسانیت کی خدمت، مخلوق خدا سے محبت، عفو درگذر، لوگوں کے حقوق کا احترام اوران کی ادائیگی، ظلم وفساد سے گریز وغیرہ۔ اس کے ساتھ وہ اسلامی تعلیمات میں سے توحید، رسالت، اخوتِ اسلامی، مساوات وغیرہ کی خصوصیات ان کے ذہن نشین کراتے تھے۔ یہی تعلیم لوگوں کو اسلام قبول کرنے کا ذریعہ بن جاتی تھی۔ اس کے بعد احکام اسلامی کی تعلیم اور عمل کرنے کی تلقین فرماتے اور ساتھ ہی ساتھ اصلاح اور تربیت کا سلسلہ جاری رہتا۔ یہ طریقۂ تبلیغ ایسا فطری تھا کہ جب ایک مرتبہ کوئی شخص عقیدت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو جاتا تو اس کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا، اور ناممکن تھا کہ وہ اسلام کی صداقت و حقانیت پر ایمان نہ لے آئے"۔

مولانا محمد الیاس رحؒ نے اپنے تبلیغ کرنے والے ساتھیوں کے لیے جو اصول مرتب کیے تھے، ان میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ

"کوئی کارکن کسی نزاعی مسئلے اور فروعی بات کو نہ چھیڑے بلکہ صرف اصول ایمان کی طرف دعوت دے اور ارکان اسلام کی تبلیغ کرے"۔

واضح رہے کہ دین کے اصولوں کو نظر انداز کر کے صرف فروع کو پیش کرنے کا ایک بڑا مضر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے صرف فروع کو قبول کر کے دینداری اختیار کی ہوتی ہے ان کی دینداری کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہوتی۔ مادہ پرستی اور بے دینی کی آندھیوں کے آگے یہ فروعات زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے اور صرف فروعات کو دین سمجھنے والے لوگ آجکل کے مخالف دین پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر ان فروعات کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ خدا، رسولؐ اور دین کی محبت، آخرت کے مواخذے کے خوف، تزکیۂ نفس، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے احترام، عدل و انصاف، امانت و دیانت، حیا و پاکبازی، اخوت و مساوات اور فرض شناسی جیسی بنیادی صفات کو نظر انداز کر کے جس دینداری کی عمارت قائم کی جائے گی، وہ جھکڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

آسانی

داعی کی دانائی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ دین کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرے

گر ..... وہ قابلِ عمل معلوم ہو۔ اس طرح نہ پیش کرے کہ مخالفین تو سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوں۔ اور خواہش مند بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ بلاشبہ دین ہے تو بہت ہی بلند اور عمدہ چیز، مگر ہم دنیادار اس پر عمل کر ہی نہیں سکتے۔ دین کو پیش کرنے کا انداز حتی الامکان ایسا اختیار کرنا چاہیئے جو آسان اور خوشگوار لگے، جیسا کہ وہ درحقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ، آیت ۱۸۵ میں فرماتا ہے:

"..... خدا تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا ....."

سورۃ النساء، آیت ۲۸ میں ارشاد ہوا ہے:

"اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔"

سورۃ الحج، آیت ۷۸ میں بیان ہوا ہے:

"(اے ایمان لانے والو) اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چُن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔"

اسلامی عقائد اس قدر سادہ اور دل نشین ہیں کہ ایک معمولی سے معمولی عقل کا انسان بھی انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ نہ ان کے اندر کسی قسم کی پیچ در پیچ فلسفیت ہے۔ نہ ان میں کسی قسم کے ظن و اوہام سے کام لیا گیا ہے، نہ ان کے اندر دور از کار باتوں کا دخل ہے۔ چند نہایت صاف اور سیدھے سے اصول ہیں ...... خدا کے متعلق اس نے بالکل واضح عقیدہ پیش کیا ہے کہ وہ ایک ہے جس میں دُوئی کا ہرگز احتمال نہیں۔ قادر مطلق ہے۔ نہ اسے اولاد کی ضرورت ہے نہ مددگاروں کی، وہ انسانی عوارض سے پاک ہے، صرف اسی سے مدد طلب کی جائے اور صرف اسی کی عبادت ہو۔

رسالت کے متعلق بھی نہایت صفائی سے بتا دیا گیا ہے نبی ایک انسان ہی ہوتا ہے جسے خدا اپنے پیغام کو اپنی مخلوق تک پہنچانے کے لیے چن لیتا ہے۔ لہٰذا نبی کی اطاعت کی جائے۔

آخرت کا عقیدہ اتنا صاف اور واضح ہے کہ نہ اسے سمجھنے میں کوئی دقت ہوتی ہے نہ وہ عقل کی رسائی سے باہر ہے۔ نہ اس میں بدھ مذہب کا بعید از عقل فلسفۂ نجات ہے نہ

ہندو مذہب کا پیچ در پیچ فلسفۂ تناسخ، نہ دہریت کا عقیدۂ فنا۔ سیدھے سادے انداز میں سمجھا دیا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہوگی جو ابدی ہوگی۔ اس میں انسان اس موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا پائے گا۔

عقائد کے بعد اسلامی عبادات بھی آسان اور قابلِ عمل ہیں اور اسلامی اخلاق اور تمدن و معاشرت کے اصول بھی ایسے ہیں جو آسانی سے سرانجام دیئے جا سکتے ہیں اور آخرت کے علاوہ اس دنیوی زندگی کی کامیابی کے بھی ضامن ہیں۔

داعی کا فرض ہے کہ اس سیدھے سادے اور آسان دین کو اسی طرح لوگوں کے سامنے پیش کرے کہ وہ لوگوں کو سیدھا سادا اور آسان ہی لگے۔ نہ انہیں مشکل اعمال کا حکم دے اور نہ انہیں ڈرا ڈرا کر دین سے متنفر کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی فرمان ایسے ملتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپؐ دین کو لوگوں کے لیے بوجھ بنانے سے روکا کرتے تھے۔ اسی خیال سے آپؐ لمبی لمبی نمازیں پڑھانے سے روکا کرتے تھے اور اسی خیال سے آپؐ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ لوگوں کو ہر وقت ڈرایا ہی جاتا رہے۔

حضرت ابو مسعود انصاریؓ کی روایت ہے کہ ایک دن کسی شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ میری فجر کی نماز رہ جاتی ہے کہ فلاں شخص ہمیں بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے۔ ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ اس پر حضورؐ غضبناک ہوئے (اتنے کہ) میں نے نصیحت کرتے ہوئے کبھی حضورؐ کو اس سے زیادہ غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا جتنے آپؐ اس دن تھے۔ آپؐ نے فرمایا۔

"اے لوگو تم (ایسی سختیاں کر کر کے لوگوں کو دین سے) نفرت دلاتے ہو، جو کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے اسے چاہیئے کہ ہلکی پڑھائے کیوں کہ نمازیوں میں مریض بھی ہوتے ہیں، بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور ضرورت والے بھی ہوتے ہیں۔" (بخاری)

بخاری کی ایک حدیث ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور پھر اپنے محلے میں واپس جا کر وہاں لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے عشاء کی نماز میں سورہ بقرہ پڑھنی شروع کر دی، جس پر ایک شخص نماز چھوڑ کر چلا گیا۔ جب حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے تین دفعہ فرمایا:

فَتَّانٌ ، فَتَّانٌ ، فَتَّانٌ ۔

یا آپؐ نے فرمایا ۔ فاتن ، فاتن ، فاتن ۔

اس سے حضورؐ کی مراد یہ تھی کہ تم اتنی لمبی لمبی نمازیں پڑھا کر فتنہ پیدا کرو گے ۔

حضرت ابوقتادہ رضؓ کی روایت ہے کہ "حضورؐ نے فرمایا کہ میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اسے طول دوں، پھر میں بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں کیونکہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ اس کی ماں کی تکلیف کا باعث بنوں ۔" (بخاری)

یہاں بچے کی ماں سے حضورؐ کی مراد وہ خواتین تھیں جو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر نماز پڑھنے آتی تھیں اور بچے بعض اوقات ماں کے نماز کی طرف متوجہ ہو جانے کے باعث رونا شروع کر دیتے تھے ۔ حضورؐ اس خیال سے کہ اگر نماز لمبی ہوئی تو بچہ زیادہ روئے گا اور ماں کو زیادہ بے چینی ہو گی، اپنی نماز مختصر کر دیتے تھے ۔

حضورؐ اس بات کو ناپسند فرماتے تھے کہ لوگوں کو ہر وقت ڈرایا ہی جاتا رہے ۔

حضرت انس رضؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا :

"(دین میں) آسانی کرو اور سختی نہ کرو اور (لوگوں کو) خوش خبری دو اور (بہت ڈرا ڈرا کر) متنفر نہ کرو ۔" (بخاری)

چنانچہ لوگوں کے لیے دین کو آسان اور خوشگوار بنانے کی خاطر یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت اور قہر اور آخرت کی جزا اور سزا کا ذکر کرتے وقت اس کے قہر کو اس کی رحمت پر غالب کر کے نہ دکھایا جائے بلکہ اس اعتدال اور تناسب کو ملحوظ رکھا جائے جو قرآن میں پایا جاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی اس پاک کتاب میں جہاں کہیں خدا کے غضب اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے ۔ عموماً ساتھ ہی اس کی رحمت اور عاقبت کے ثواب کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے ۔ برائی کے عبرتناک انجام اور نیکی کے شیریں ثمرات کو پہلو بہ پہلو دکھانے سے مقصد یہ ہے کہ انسان نہ تو بے لگام ہی ہونے پائے اور نہ خوف کی شدت کے باعث بالکل آس ہی توڑ بیٹھے بلکہ خوف اور امید کی اس درمیانی حالت میں رہے

جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ

الایمان بین الخوف والرجاء۔ "ایمان تو خوف اور امید کی درمیانی حالت کا نام ہے"

غرضیکہ دین جیسا کہ آسان ہے اسے آسان ہی بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ بعض لوگوں کی طبائع اتنی بے لگام ہو چکی ہوتی ہیں کہ انہیں اس آسان دین کے احکام بھی مشکل لگتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو ان کی طبیعتوں کی بے لگامی ہے اور دوسرے یہ حقیقت کہ ماحول اسلامی احکام کے لیے بہت کچھ ناسازگار ہو چکا ہے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ماحول کو ناسازگار بنانے میں جہاں ایک طرف غیر اسلامی نظریات کے دنیا میں عام ہو جانے کا دخل ہے، وہاں ہماری اپنی غفلت اور دینی بے پروائی کا بھی کچھ کم حصّہ نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی اپنی ایک تصنیف "گناہ بے لذت"، میں فرماتے ہیں:

" اگر ذرا بھی غور کریں تو معلوم ہوگا کہ شریعت اسلامی میں نہ کوئی تنگی ہے نہ دشواری بلکہ دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ معاشی آسانیاں اس میں ہیں۔ البتہ جب کسی چیز کا رواج ہی نہ رہے، اس پر عمل کرنے والے بہت کم رہ جائیں تو آسان سے آسان چیز بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ ٹوپی اور پائجامہ پہننا کس قدر آسان ہے لیکن اگر کسی خطۂ ملک میں یہ چیزیں متروک ہو جائیں تو ٹوپی اور پائجامے کا بنانا اور بنوانا ایک مستقل مہم ہو جائے گا، روٹی پکانا اور کھانا کس قدر سہل اور ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے، لیکن اگر کسی جگہ اس کا مطلق رواج نہ رہے، سب چاول کھانے لگیں، وہاں دیکھیے کہ روٹی پکانا اور کھانا کس قدر دشوار ہو جائے گا۔

یہی حال دینی امور کا سمجھنا چاہیئے۔ اوّل تو غیر مسلموں کی اکثریت سے مسلمانوں کے لیے بہت سی دشواریاں حلال و حرام کے معاملے میں پیدا ہو جانا طبعی امر تھا مگر مسلمان باوجود اقلیت کے بھی اگر مذہبی حدود و قیود کے پابند ہوتے تب بھی قوی امید تھی کہ بہت سے معاملات میں کوئی اشکال نہ رہتا۔ آخر آج اسی لامذہبی کے دور میں یورپ جیسے لامذہب ملک سے بہت سی دواؤں کے لیبل میں ہندوؤں کی رعایت سے یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ اس دوا میں کوئی حیوانی جزو شامل نہیں ــ یہ کیوں؟ اس لیے نہیں کہ کارخانہ والوں کو ہندو

مذہب سے کوئی ہمدردی یا خوش اعتقادی کا تعلق ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہندو عوام حیوانی اجزاء سے پرہیز کرتے ہیں۔ مگر آج تک کسی لیبل پر یہ نظر نہ پڑا کہ اس دوا میں شراب یا سپرٹ شامل نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کی غفلت اور بے پروائی نے ان کے سامنے ایسا ثبوت پیش نہ کیا کہ مسلمان قوم اس سے پرہیز کرتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تنگی اور دشواری سب ہماری غفلت اور بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ سب مسلمان دینی امور کے پابند ہو جائیں تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب سہل ہو جائیں اور گناہوں سے بچنا طبعی امر ہو جائے۔"

غرضیکہ دین اسلام درحقیقت ایک آسان دین ہے اور ماحول سے غیر اسلامی نظریات کا قبضہ ڈھیلا کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم خود اس کے احکام کے پابند رہیں اور دوسروں کو ان کے پابند بنانے کی کوشش کرتے رہیں۔

اس خیال سے کہ لوگ دین سے بیزار نہ ہو جائیں اور تنگی محسوس نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا بھی دھیان رکھتے تھے کہ انہیں وقفہ دے دے کر نصیحت کی جائے۔

ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے تو ان سے ایک شخص نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں ہر روز وعظ سنایا کریں۔ اس پر حضرت عبداللہؓ بولے کہ (روز روز کے وعظ سے) مجھے صرف یہ امر مانع ہے کہ تم لوگ رنجیدہ نہ ہو جاؤ (یعنی اکتا نہ جاؤ) میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت کرتا ہوں جیسے حضورؐ ہمیں ناغہ کر کے نصیحت کرتے تھے اس خوف کے باعث کہ کہیں ہم (زیادہ نصیحتیں سن سن کر) بیزار نہ ہو جائیں۔ (بخاری)

موقع شناسی

داعی کی دانائی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس میں موقع شناسی کی صفت موجود ہو۔ موقع شناسی میں ایک طرف تو یہ ضروری ہے کہ انسان بے موقع اور بے محل بات کر کے اپنی بات کو ضائع نہ کرے اور دوسری طرف یہ لازمی ہے کہ جب اتفاق سے

کوئی مناسب موقع دستیاب ہو جائے تو اسے ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ بخاری میں حضرت عکرمہؓ کی ایک روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا:

"لوگوں کو جمعہ جمعہ وعظ کیا کرو، اگر اس سے زیادہ چاہو تو ہفتے میں دو بار، اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو تو تین بار، اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار نہ کرو، اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم لوگوں کے پاس ایسے وقت میں آؤ جب وہ اپنی کسی بات میں مصروف ہوں اور اس وقت ان کی بات کاٹ کر ان کو وعظ سنانا شروع کر دو اور اس کا نتیجہ صفر ہی ہو۔ ایسے موقع پر خاموش رہو یہاں تک کہ لوگ تمہیں (وعظ) سنانے کو کہیں اور اس کی خواہش رکھتے ہوں تو پھر انہیں سناؤ۔" (بخاری)

مراد یہ ہے کہ جس وقت لوگ بہت مصروف ہوں یا کسی اور وجہ سے بات سننے کی طرف مائل نہ ہوں اس وقت زبردستی انہیں ... سنا کر بات کو ضائع کرنے اور ان لوگوں کو تنگ دل کرنے سے یہ بہتر ہے کہ بات کو کسی بہتر موقع کے لیے اٹھا رکھا جائے۔ مواقع سے ہوشیاری سے فائدہ اٹھا لینے کی مثال سمجھنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کی حالتِ اسیری کا وہ واقعہ یاد کر لینا مفید ہوگا جو سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے۔

جب حضرت یوسفؑ کو ناکردہ گناہ قیدخانے میں قید کر دیا گیا تو آپؑ کے وہاں کے قیام کے دوران میں کچھ قیدیوں نے بعض خواب دیکھے جن کی وہ تعبیر معلوم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کی نیکی اور پاکیزہ اطوار ہی کا ان پر اتنا اثر تھا کہ وہ تعبیر پوچھنے کے لیے آپؑ کے پاس آ گئے اور تعبیر معلوم کرنے کے لیے آپ کو چننے کی وجہ یہ بتائی کہ:

اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں)

(سورہ یوسف، آیت ۳۶)

جب حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ وہ اس وقت اس موڈ میں ہیں کہ جو کچھ انہیں بتایا جائے گا اس پر یقین کریں گے اور اثر قبول کریں گے تو آپؑ نے انہیں خوابوں کی تعبیر بتانے سے پہلے توحید کا درس دے دیا اور فرمایا:

"یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے

کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو، کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

(سورہ یوسف، آیات ۳۷ تا ۴۰)

اس کے بعد آپؑ نے انہیں اُن کے خوابوں کی تعبیر بتا دی۔

مناسب مواقع سے ہر وقت فائدہ اٹھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ذہن کو ہمہ وقت تیار رکھا جائے۔ لبسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ اچانک تبلیغ کے لیے کوئی قیمتی موقع مل جاتا ہے مگر چونکہ ذہن تیار نہیں ہوتا اس لیے حیص بیص ہی میں وہ وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

اب ذرا اس لفظ "موقع شناسی" کو اور وسیع معنوں میں لیں تو پتہ چلتا ہے کہ زندگی بذاتِ خود ایک قیمتی موقع ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک دعا ہے کہ

"خدایا اوقاتِ زندگی میں برکت دے اور انہیں صحیح مصرف میں لگانے کی توفیق عنایت فرما۔"

ایک مشہور مقولہ ہے، اَلْوَقْتُ مِنَ الذَّهَب (وقت سونا ہے)

ایک اور مقولہ ہے، اَلْوَقْتُ هُوَ الْحَيَاةُ (وقت ہی زندگی ہے)

جناب حسن البناء شہیدؒ اپنے ساتھیوں کو گناہوں سے بچنے اور محاسبۂ نفس کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وقت کی حفاظت کیجیے، کیونکہ اصل زندگی تو یہی ہے۔ ایک لمحہ بھی بیکار نہ گزارئیے اور مشتبہ چیزوں سے بچتے رہیے تاکہ آپ حرام کے مرتکب نہ ہونے پائیں۔"

زندگی کے اوقات میں وہ وقت اور بھی زیادہ قیمتی ہوتا ہے جب صحت، خوش حالی اور امن حاصل ہو کہ اس میں انسان زیادہ اطمینان سے اپنے فریضۂ تبلیغ کو ادا کر سکتا ہے مسدس حالی کا ایک بند ہے۔

غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے اقامت مسافر کی رحلت سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مہلت

صد افسوس کہ یہی قیمتی اوقات ہم زیادہ بے دردی سے ضائع کرتے ہیں۔ صدیوں سے مسلمانوں کی یہ کیفیت چلی آ رہی ہے کہ جب کوئی بڑی قومی مصیبت آ کر پڑی تو تھوڑی دیر کے لیے بیدار ہو گئے۔ اس وقت یہ احساس بھی عام ہو جاتا ہے کہ یہ مصائب دین کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے خارج کر دینے کے باعث ہی آتی ہیں۔ چنانچہ اسلام اسلام کی لپکار شروع ہو جاتی ہے۔ مگر جیسے ہی سختی کے دن ذرا ٹلے پھر وہی غفلت اور بے پروائی۔ کس کا اسلام اور کہاں کی تبلیغ!

علامہ اقبال رحؒ نے فرمایا ہے ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ!

مگر ہمارا اب یہ حال ہے کہ خزاں میں تو پھر بھی اس نغمے کو تھوڑا بہت الاپ ہی لیتے ہیں مگر بہار میں بالکل ہی بھول جاتے ہیں اور بہار میں اسے بالکل بھلا ہی دینے کا نتیجہ ہوتا ہے کہ خزاں وقت سے پہلے آ دھمکتی ہے۔ جس صبر و استقامت کا ایک مومن سے مطالبہ کیا جاتا ہے وہ نہ صرف حالت امن و مسرت کے ساتھ مخصوص ہے نہ صرف زمانۂ خوف و غم کے ساتھ، وہ تو پوری زندگی پر محیط ہے۔ اگر خوشی اور امن کے زمانے میں لوگ

نیک اعمال کرنے اور نیک اعمال کی طرف بلانے میں مصروف رہیں تو مصائب کی خزاں آتی ہی نہیں۔ یہ فرصت، امن اور آرام کے زمانے کو غلط طور پہ استعمال کرنے ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ پھر بلائیں منہ کھولے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ استقامت صرف یہی نہیں کہ مشکلات کے وقت انسان ثابت قدم رہے۔ استقامت یہ بھی ہے کہ آرام اور امن کے وقت اپنے نصب العین کو بھلا نہ دے۔

راہِ حق کے داعیوں کو دو آگوں کی مثال سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ایک الاؤ کی آگ اور دوسری تنور کی آگ۔ الاؤ کی آگ ایک دم بھڑکتی ہے، اس کے شعلے آسمان کی طرف لپکتے ہیں، ایک دنیا اسے بھڑکتے ہوئے دیکھتی ہے مگر اس پر کچھ پک نہیں سکتا کیونکہ وہ جلد ہی بجھ کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس تنور کی آگ اندر ہی اندر جلتی ہے۔ لوگوں کو نظر بھی نہیں آتی مگر چونکہ وہ دیر تک جلتی رہتی ہے، اس پر روٹی پک جاتی ہے۔

ایسے ہی جو داعی اپنی حبِ دین کی آگ کو سینے میں فروزاں رکھے گا اور صبر و تحمل سے چپ چاپ مسلسل اور متواتر کام کرتا رہے گا، وہ تھوڑا تھوڑا کام کرتے رہنے کے باوجود دین کے لیے بدرجہا زیادہ مفید ہوگا بہ نسبت ان لوگوں کے جو وقتی طور پر تو خوب سرگرمی کا اظہار کریں مگر جونہی حالات ذرا بدلیں، بات کو بھول جائیں اور دوسری دوسری دلچسپیوں میں کھو جائیں۔

خلاصہ یہ کہ ایک سچے داعی کا فرض ہے کہ اپنی بات پیش کرتے وقت اپنے جسم و جان اور سمجھ بوجھ کی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر کوشش کرے کہ اس کی بات زیادہ سے زیادہ مؤثر ثابت ہو۔

تاہم ہر ممکن احتیاط برتنے کے باوجود اگر اسے یہ نظر آئے کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ محنت کر رہا تھا وہ دین کی طرف نہیں آئے تو اس میں نا امید یا دل شکستہ ہونے کی قطعی کوئی بات نہیں۔ اسے پوری تسلی رکھنی چاہیے کہ جس کی راہ میں یہ ساری تگ و دو کی جا رہی ہے، وہ انتہائی قدر شناس ہے اور کبھی بھی کسی مخلص کی مخلصانہ کوششوں کو رائگاں جانے نہیں دیتا۔

انسان دوستی

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا:

"اے آدم کے بیٹے، میں بیمار ہوا تو تُو نے میری عیادت نہ کی۔"

(انسان) کہے گا: "اے میرے رب میں تیری کس طرح عیادت کرتا جب کہ تو رب العالمین ہے۔"

خدا تعالیٰ فرمائے گا۔ "کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو تُو نے اس کی عیادت نہ کی۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدمؑ کے بیٹے، میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے مجھے کھانا نہ دیا۔"

(انسان) کہے گا: "اے میرے رب، میں تجھے کیسے کھانا دیتا جب کہ تو رب العالمین ہے۔"

خدا فرمائے گا۔ "کیا تجھے علم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے اُسے کھانا نہ دیا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اسے کھانا دیتا تو اُسے میرے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تُو نے مجھے پانی نہ پلایا۔"

(انسان) کہے گا: "اے میرے رب، میں تجھے کیسے پانی پلاتا جبکہ تو رب العالمین ہے۔"

خدا فرمائے گا۔ "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تُو نے اسے پانی نہ پلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اُسے پانی پلاتا تو اُسے میرے پاس پاتا۔" (مسلم)

یہ حدیث انتہائی عمدگی سے عکاسی کر رہی ہے۔ اس شفقت، رحمت اور محبت کی جو اس رؤف و رحیم مالک کو اپنے بندوں سے ہے کہ اپنے بندوں کی ضروریات کو وہ اپنی ضروریات بتا رہا ہے حالانکہ وہ بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے انسانوں پر انتہائی مہربان ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے

ناموں میں سے کم و بیش ۳۵ نام ایسے ہیں جن میں شفقت فرمانے، حفاظت کرنے اور عطا کرنے کا مفہوم ہے اور صرف چھ سات ایسے ہیں جن سے سختی اور سزا کا اظہار ہوتا ہے۔ جو نام اللہ تعالیٰ کی مہربانی، رحمت اور بخشش کا اظہار کرتے ہیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:

اَلرَّحْمٰنُ	بڑا مہربان	اَلْبَرُّ	احسان کرنے والا
اَلرَّحِیْمُ	نہایت رحم کرنے والا	اَلْوَهَّابُ	سب کچھ دینے والا
اَلرَّءُوْفُ	بہت نرمی کرنے والا	اَلرَّزَّاقُ	روزی دینے والا
اَلْوَدُوْدُ	محبت کرنے والا	اَلْوَاسِعُ	کشائش دینے والا
اَلرَّافِعُ	بلند کرنے والا	اَلْمُعِزُّ	عزت دینے والا
اَلْغَفَّارُ	بڑا بخشنے والا	اَلشَّكُوْرُ	قدر دانی کرنے والا
اَلْغَفُوْرُ	بڑا بخشنے والا	اَلْحَفِیْظُ	نقصان سے بچانے والا
اَلتَّوَّابُ	توبہ قبول کرنے والا	اَلْمُقِیْتُ	روزی دینے والا
اَلْعَفُوُّ	درگذر کرنے والا	اَلْكَرِیْمُ	سخی، بندوں کا حاجت روا
اَلْقَیُّوْمُ	سب کو تھامنے والا	اَلْحَسِیْبُ	کفایت کرنے والا
اَلرَّقِیْبُ	نگہبانی کرنے والا	اَلْعَدْلُ	انصاف کرنے والا
اَلْوَكِیْلُ	کارساز	اَلْفَتَّاحُ	کھولنے والا
اَلْوَلِیُّ	حمایت کرنے والا	اَلْبَاسِطُ	کشادہ کرنے والا
اَلْمُجِیْبُ	قبول کرنے والا	اَلْحَلِیْمُ	بردباری کرنے والا
اَلْمُغْنِیْ	دوسروں سے بے پروا کرنے والا	اَلْمُؤْمِنُ	امن دینے والا
اَلنَّافِعُ	نفع دینے والا	اَلْمُهَیْمِنُ	نگہبان
اَلْهَادِیْ	ہدایت دینے والا	اَلرَّشِیْدُ	بھلی راہ بتانے والا

اَلْمُحْیِیْ — زندگی عطا کرنے والا

جن ناموں میں ناراضی اور سزا دینے کا مفہوم ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

اَلْقَابِضُ	تنگی کرنے والا	اَلْمُنْتَقِمُ	بدلہ لینے والا

اَلْخَافِضُ پست کرنے والا اَلضَّآرُّ ضرر پہنچانے والا
اَلْمُذِلُّ ذلیل کرنے والا اَلْمُمِیْتُ موت وارد کرنے والا وغیرہ

اللہ تعالیٰ خود اپنی کتاب میں بار بار اپنی اس صفت کا اظہار کرتا ہے کہ میں اپنی مخلوق پر بہت زیادہ مہربان ہوں۔ سورہ الحجر ، آیت ۴۹ میں ارشاد ہوا ہے :

"(اے نبی) میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگذر کرنے والا ہوں، اور رحیم ہوں ...."

سورہ الاعراف، آیت ۱۵۶ میں فرمایا ہے :

"سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔"

سورۃ الانعام، آیت ۱۲ میں بیان ہوا ہے :

"(اے نبی) ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے ؟ کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔"

سورہ رعد، آیت ۶ میں ارشاد ہوا ہے :

"(اے نبی) حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود انہیں بخشش عطا کرتا ہے۔"

سورہ لبقرہ، آیت ۲۴۳ میں فرمایا ہے :

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسان پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔"

انسانوں کے مختلف گناہوں کے جو کفارے رکھے گئے ہیں، ان میں سے بہت سے کفارے ایسے ہیں جن سے خود انسان ہی کو فائدے پہنچائے گئے ہیں۔ کہیں مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم ہے، کہیں مسکینوں کو کپڑے پہنانے کا، کہیں غلام آزاد کرنے کا۔ رمضان کے دوران میں جو شخص روزہ رکھ کر بغیر کسی عذر شرعی کے توڑ دے۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ دو مہینوں کے مسلسل روزے رکھے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

جو شخص غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مسلمان غلام کو

آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو دیت ادا کرے۔

جو شخص قسم کھا کر توڑ دے اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنائے یا غلام آزاد کرے اور اگر اس کا مقدور نہ ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھے۔

اسلامی تہواروں پر نگاہ ڈالیے۔ دونوں عیدوں میں جہاں نماز عید لازم کی گئی ہے وہاں فطرانے اور قربانی کی شکل میں انسانوں کو فائدہ پہنچانے کا اہتمام بھی موجود ہے۔

خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انسان دوستی جس پائے کی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی رح فرماتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئی تھی۔۔۔۔"

خداوند ازل نے خطاب فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

"(اے نبی) ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔"

اس خزینہ رحمت میں دوست دشمن، کافر مسلم، بوڑھے بچے، عورت مرد، آقا و غلام، انسان و حیوان ہر ایک صنف ہستی برابر کی حصہ دار تھی۔

حضرت ابوہریرہ رض بیان کرتے ہیں کہ طفیل بن عمرو دوسی اور ان کے ساتھی رسول خدا صلی اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے خدا کے رسول (قبیلہ) دوس نے نافرمانی کی اور آپ کی اطاعت سے) انکار کیا، آپ اللہ سے ان کے لیے بددعا کیجیے۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ اب قبیلہ دوس ہلاک ہو جائیگا کیونکہ حضور ان کیلئے بددعا کریں گے اور بددعا کے باعث خدا انہیں برباد کر دیگا حضور نے بددعا نہ کی بلکہ) دعا کی کہ اے خدا دوس کو ہدایت دے اور انہیں دائرہ اسلام میں لے آ (بخاری)

حضرت انس رض سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب لوگوں کے لیے وہی محبوب نہ رکھے جو اپنے لیے رکھتا ہے اور جب تک وہ دوسروں کو بے غرض، صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے۔"

ان آیات پاک اور احادیث مقدسہ کی روشنی میں داعی کا ایک اور وصف متعین

ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے دل میں بنی نوع انسان کے لیے سچی محبت اور دلی خیر خواہی موجود رہے۔

سوچا جائے تو انسان درحقیقت اپنی فطرت کی رو سے انسان دوست ہی واقع ہوا ہے۔ اسے دنیا جہاں کے عیش او رخوشیوں کے سامان مہیا کر دیجیے اور پھر اسے دوسرے انسانوں سے علیحدہ کر کے تنہا رہنے پر مجبور کیجیے، وہ کبھی بھی خوش نہیں رہ سکے گا اور وہ خوشیوں کے سامان اس کے لیے بے معنی ہوں گے۔ لیکن اپنی فطرت کی اس انسان دوستی کے باوجود وہ اپنے عمل میں انسان دشمنی کی انتہا کر دیتا ہے۔ اسلام نے اسے یہی تلقین کی ہے کہ وہ اپنی فطرت کی اس انسان دوستی کو اپنے عمل سے باطل نہ کرے اور جس کے بغیر رہ نہیں سکتا. اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا التزام بھی کرتا رہے اور اس کا خیر خواہ بھی ہو۔

اب محبت اور خیر خواہی کا قدرتی تقاضا یہ ہے کہ جو ہستی محبوب ہو اسے ہر قسم کی تکلیف سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ یہ بہت عجیب بات ہوگی کہ ہمیں کسی سے محبت بھی ہو اور اس کے بغیر ہم رہ بھی نہ سکیں، مگر اس بات کی پرواہ نہ کریں کہ وہ ہستی راحت و آرام اور کامیابی و سرفرازی حاصل کرتی ہے یا اذیتوں اور تکلیفوں کا شکار اور ذلتوں اور رسوائیوں کا نشانہ بنتی ہے۔ خدا اور خدا کے رسول ؐ نے بھی انسان کے ساتھ اپنی شفقت کا اظہار اسی طرح کیا تھا کہ اسے ان اعمال کی طرف بلایا تھا جو اسے دین اور دنیا دونوں کی تکالیف سے بچا کر دین اور دنیا دونوں کی راحتوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کریں۔ چنانچہ داعی کے لیے بھی ضروری ہے کہ خدا اور رسول ؐ کے رویے کی اطاعت کرتے ہوئے بنی نوع انسان سے محبت رکھے اور محبت کے اظہار کے لیے وہی طریقے اختیار کرے جو خدا اور رسول ؐ نے اختیار کیے تھے۔ انسان دوستی کسی ظاہری لیپا پوتی یا زبانی جمع خرچ کا نام نہیں ہے بلکہ دلی ہمدردی اور حقیقی خیر خواہی کا نام ہے جو انسان اپنے ابنائے جنس کا واقعی خیر خواہ ہوگا اس کے دل میں یہ تڑپ خود بخود ہی پیدا ہو جائے گی کہ وہ انہیں اس دین کی طرف لانے کی کوشش کرے جو اسے دنیوی اور اخروی دونوں سعادتوں سے مالامال کر دیتا ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ جسے دین کہا گیا ہے۔

وہ صرف آخرت ہی میں بہشت عطا نہیں کرتا بلکہ اس دنیوی زندگی کو بھی بہشت بناتا ہے۔
دین درحقیقت اس دنیوی زندگی ہی کو گزارنے کا ایک کامیاب، دانائی سے بھرا ہوا
اور مفید طریقہ ہے۔ اس کی افادیت یہ ہے کہ جب ہم یہ زندگی دین کے طریقے پر چل کر گزارتے
ہیں، تو خود اس دنیا میں بھی دکھ کم ہوتے ہیں اور سکھ پھیلتے ہیں اور آخرت میں بھی سرخروئی
حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ وہ دین کو صرف آخرت کی بہتری کا
ذریعہ سمجھتا ہے حالانکہ دین آخرت ہی کو نہیں دنیا کو بھی بہتر بناتا ہے۔

انسان روح اور جسم کا مرکب ہے اور اس کی زندگی دنیا اور آخرت دونوں میں پھیلی
ہوئی ہے۔ اگر اسے کوئی ایسا مذہب دیا جاتا جو اس کی روح اور آخرت کی زندگی کے لیے
تو کامیابی کا باعث بنتا مگر اس کے جسم اور اس کی دنیوی زندگی کو کوئی فائدہ نہ پہنچاتا تو
وہ مذہب اس کے لیے ایک نامکمل چیز ہوتی، کیونکہ جسم اور دنیوی زندگی بھی بہرحال اس کے
ساتھ لگی ہوئی ہے اور اپنے تقاضے پورے کروانے پر مصر رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں پر
اس سے بہت زیادہ شفیق ہے کہ وہ انہیں ایک ایسا نامکمل طریقۂ زندگی عطا کرتا جو اس
کے کچھ حصوں کے لیے تو مفید ہوتا مگر باقی کے لیے بے فائدہ یا مضر ہوتا۔ پیغمبر آخر الزماں
رحمۃ اللعالمین کے روپ میں جس طریقۂ زندگی کو لے کر آئے تھے وہ انسان کے جسم اور روح،
دنیوی زندگی اور اخروی زندگی سب کے لیے یکساں طور پر مفید اور وجہ کامیابی و کامرانی ہے۔
یہاں چند احکام پر غور کر کے دیکھ لیں کہ کس طرح وہ ایک طرف اخروی ثواب عطا کرتے ہیں،
اور دوسری طرف دنیوی سعادت۔

اللہ تعالیٰ نے ہر بالغ مسلمان پر نماز فرض کی ہے اور نماز جہاں ایک طرف آخرت کا
اجر و ثواب اور اعزاز و اکرام عطا کرتی ہے وہاں دوسری طرف اس دنیوی زندگی میں پاک و
صاف رہنے، اوقات کی پابندی کرنے، اطاعت امیر کرنے اور نظم و ضبط کا عادی ہونے
کی مشق کراتی ہے۔ نماز پنجگانہ، نماز جمعہ، عیدین کی نمازیں اور حج کی ادائیگی مسلمانوں کو یہ موقع
بہم پہنچاتی ہیں کہ ایک محلے کے لوگ دن میں پانچ مرتبہ ایک دوسرے سے ملیں، چند محلوں
کے ہفتے میں ایک دفعہ باہم ملاقات کریں، سارے شہر کے لوگ سال میں دو دفعہ باہم

اکٹھے ہوں اور دنیا بھر کے مسلمان زندگی میں ایک دفعہ ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ ملّت کی اجتماعی زندگی کے لیے یہ اجتماعات نہایت درجہ مفید ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب استطاعت شخص کو زندگی میں کم از کم ایک دفعہ حج کرنے کا حکم دیا ہے۔ حج کی عبادت ایک طرف تو وہ اخروی اجر و ثواب عطا کرتی ہے کہ بقول رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جس نے حج کر لیا وہ ایسا پاک ہو گیا جیسا وہ اپنی پیدائش کے وقت تھا اور دوسری طرف اس فریضے کی ادائیگی دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک مرکز فراہم کر دیتی ہے جہاں ہر سال مسلمانوں کی گویا ایک عالمگیر کانفرنس کے انعقاد کا بندوبست ہو جاتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے لیے تکلف سے کوئی کوشش کی جائے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کے حالات میں آتا ہے کہ جب آپ نے فوجوں کو کمک بھیجنا ہوتی تھی یا کوئی اور اہم بات سب کو بتانا ہوتی تھی تو وہ حج کے اجتماعات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ خود حضورؐ نے حج کے اجتماعات میں تبلیغ اسلام کی۔ مدینے کے جو لوگ سب سے پہلے اسلام سے متعارف ہوئے تھے، انہیں ایامِ حج ہی کے دوران حضورؐ کی دعوتِ دین کو سننے کا اتفاق ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو فرض کر کے، سود کو حرام قرار دے کر اور میراث کی تقسیم کو لازمی بنا کر ایک طرف تو اخروی اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا ہے اور دوسری طرف دنیوی طور پر ملت میں تقسیم دولت کا منصفانہ بندوبست کر دیا ہے۔ زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت اور تقسیم میراث کے حکم کے باعث دولت تھوڑے سے ہاتھوں میں قید رہنے کے بجائے سب طبقات میں گردش کرتی ہے۔ تقسیم میراث ایک شخص کی دولت کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر کے پھیلاتی ہے اور زکوٰۃ سے دولت امیروں کی جیبوں سے نکل نکل کر غریبوں کے پاس پہنچتی ہے اور سود کی حرمت اس بے انصافی کے راستے میں روک ہے کہ امیر تو اپنے فالتو پیسے کے ذریعے اور زیادہ پیسہ کھینچتا چلا جائے اور غریب کے پاس جو تھوڑا سا ہے وہ بھی اس سے چھن کر امیر کے پاس پہنچ جائے۔ دولت کی یہ منصفانہ گردش قوم کی معاشی خوش حالی کو بڑھاتی اور خوشحال اور غریب طبقات کے درمیان نفرت کی جنگ جاری کرنے کے بجائے باہمی محبت اور اعتماد کی فضا قائم کرتی ہے۔

اسلام نے عورتوں کو تحفظ عصمت، وعفت اور اپنی زینت کو نامحرموں پر ظاہر کرنے سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے اور مردوں کو پاکیزہ چلنی اور نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ یہ اطوار جہاں آخرت میں بہشت کا مستحق ٹھہراتے ہیں وہاں دنیوی زندگی میں بھی شوہر اور بیوی کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم کر کے ازدواجی زندگی کو پرسکون بناتے ہیں۔ اور باہر معاشرے میں بھی نیک چلنی اور پختگیٔ سیرت وکردار کو عام کر کے معاشرے کو بے شمار رسوا کن اور ذلیل قسم کی پیچیدگیوں اور مسائل سے محفوظ کرتے ہیں۔

اسلام میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہاد کا اخروی اعزاز تو بے پایاں ہے ہی، خود اس دنیوی زندگی میں بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جس قوم میں حق کی خاطر جان دینے والے جانفروش موجود رہیں، وہ نہ دشمن کے آگے ذلیل ہوتی ہے نہ کسی کی غلام بن کر بے عزتی کی پُر اذیت زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ بقول حضرت ابوبکر صدیق ؓ:

"موت سے محبت کرو گے تو زندگی عطا کی جائے گی"۔

غرضیکہ دین کے سب احکام ایسے ہیں کہ ان پر عمل کرتے وقت مقصد تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہی ہوتا ہے مگر یہ دنیوی زندگی بھی ساتھ ہی درست ہوتی چلی جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا فرمان ہے:

"اپنی حفاظت اللہ کے نام سے کرو، اللہ تمہیں شکست اور وبا سے محفوظ رکھے گا"۔

دینِ اسلام کے احکام کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے گھر بنوایا اور ایک طرف کھڑکی رکھوائی۔ ایک بزرگ آئے اور پوچھا کہ کھڑکی کیوں رکھوائی؟ گھر کے مالک نے کہا تاکہ ہوا آئے۔ بزرگ بولے کہ اگر تم نیت یہ کر لیتے کہ اِدھر سے اذان کی آواز آئے تو تمہیں ثواب مل جاتا۔ اور ہوا کو تو کھڑکی کے راستے آنا ہی تھا۔

یہی حال اسلام کے احکام کا ہے۔ جیسے کھڑکی میں سے اذان کی آواز بھی سنائی دیتی ہے اور ساتھ ہی صحت کو درست رکھنے والی ہوا بھی لازماً آتی ہے۔ ایسے ہی اسلامی احکام آخرت کی سرفرازی بھی عطا کرتے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کی کامیابی، کامرانی اور سرفرازی بھی لازماً دیتے ہیں۔

سورۃ المائدہ آیت ۶۶ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابوں تورات اور انجیل کو قائم کرتے تو

"ان کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے رزق ابلتا" یعنی بے پناہ معاشی خوش حالی حاصل ہوتی۔

سورہ ہود کی ابتدائی آیات میں فرمایا ہے:

"ا، ل، ر (یہ ایک) کتاب ہے جس کی آیتیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے پختہ اور مفصّل ارشاد ہوئی ہیں کہ تم صرف اللہ ہی کی بندگی کرو۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی، اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ کر آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔"

ان آیات میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ ہی کی بندگی کرنے والوں، اس سے معافی چاہنے والوں اور اس کی طرف پلٹ کر آنے والوں کو وہ "اچھا سامانِ زندگی عطا کرے گا"۔

"ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا" کا مفہوم یہ بتایا جاتا ہے کہ جو شخص بھی اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے اپنے آپ کو جس فضلیت کا مستحق ثابت کرے گا وہ فضلیت اس کو ضرور دی جائے گی۔

سورۃ الانفال، آیت ۲۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اے ایمان لانے والو، اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔"

یہاں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ خدا کا رسول جس چیز کی طرف بلا رہا ہے، اس میں تمہارے لیے زندگی ہے۔

دین کے بارے میں یہ تصور کہ وہ صرف آخرت کی آگ سے ہی بچاتا ہے ایک ادھورا تصور ہے۔ آگ صرف آخرت ہی کی تو نہیں، اس دنیا میں بھی انواع و اقسام کی آگیں بھڑکتی

رہتی ہیں جن سے اگر بچنے کی کوشش نہ کی جائے تو وہ جسم و جان دونوں کو جلا کر خاک کر دیتی ہیں۔

جو لوگ فسق و فجور اور بداعمالیوں سے باز نہیں آتے انہیں آخرت میں جو سزا ملے گی وہ تو ملے گی ہی، خود اس دنیا میں بھی وہ بالآخر رسوائی کا نشانہ اور ذلیل، گھناؤنی اور جان لیوا بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جہاں دولت ہی معبود بن جائے گی وہاں حرص و آز ایک مستقل بے چینی پیدا کیے رکھے گی اور راشی افسر، بددیانت منصف، خائن تاجر، خودغرض حکمران اور بے وفا عوام سب ایک دوسرے کی زندگیوں کو اجیرن کر دیں گے۔

جہاں لوگ دلوں میں حسد اور کینے پالیں گے اور ایک دوسرے کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے وہاں باہمی دشمنیاں قوم کو صدہا گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے سے لڑاتی رہیں گی اور دشمن ان کی ناچاقیوں سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔

جہاں لوگ عزت کی موت پہ ذلت کی زندگی کو ترجیح دینے لگیں گے وہاں بالآخر غیروں کی غلامی کا جوا گلے میں پڑ کر رہے گا۔

فرد کی انفرادی زندگی پر بھی گناہوں کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ حکیم اقبال حسین صاحب اپنی انتہائی مفید کتاب "بڑھاپا اور اس کا سدِ باب" میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح انسان کے جذبات اور طور طریقے اس کی جسمانی صحت پہ گہرے اثر ڈالتے ہیں۔

"آج یہ امر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جسم اور دماغ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ ہمارا دماغ ہمارے جذبات کا مرکز ہے اور ان جذبات کا اثر ہمارے نظامِ جسمانی پر برابر پڑتا ہے۔ ذرا کبر و غرور کو اپنے اوپر مسلط ہونے کا موقع دے دیجیے پھر دیکھیے کہ اعصاب میں کس درجہ تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

ذرا غیظ و غضب کا دورہ اپنے اوپر پڑنے دیجیے پھر دیکھیے کہ یہ کس طرح آپ کے دورانِ خون میں حدت پیدا کرتا ہے اور قلب کو متاثر کرتا ہے۔

ذرا لالچ اور حرص کو اپنے اوپر قبضہ کرنے دیجیے، پھر دیکھیے کہ یہ کس طرح آپ کو گھن کی طرح

کھا جائے گا اور خرابیٔ جگر کے باعث آپ کے چہرے پہ زردی کھنڈ جائے گی۔

ذرا نفرت اور حسد کو اپنے دل میں موجزن ہونے دیجئے، پھر دیکھیے کہ یہ کس طرح آپ کے خون کے دباؤ کو بڑھا دیتا ہے اور جسمانی اعتبار سے کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔

جب حقیقتِ حال یہ ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ جسمانی صحت کا کوئی تصور اپنے ذہن کو غلط قسم کے جذبات و تصورات سے پاک کیے بغیر آپ کر سکتے ہیں۔

اچھے جذبات و تصورات درحقیقت ہمارے جسم کے انجن کے لیے ایک صحیح قسم کے ایندھن کا کام کرتے ہیں۔ آپ کی کار کا انجن مٹی کے تیل سے بھی چل سکتا ہے لیکن اس کے لیے صحیح ایندھن مصفیٰ پیٹرول ہے۔ اگر آپ اس میں صحیح ایندھن استعمال کریں گے تو آپ کی کار کے انجن کی قوتِ کار بہت بڑھ جائے گی اور وہ زیادہ دیر بغیر خراب ہوئے چل سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح آپ اپنی جسمانی حالت کو قیاس کر لیجیے۔ اگر آپ کے اندر ہمدردی، رحم، عفو درگذر، صلۂ رحمی، حسنِ ظن، رجائیت اور شادباشی جیسی اعلیٰ خصلتیں موجود ہیں تو گویا آپ کے جسم کے اندر بہت عمدہ قسم کا ایندھن موجود ہے اور وہ آپ کے جسم کی گاڑی کو منزلِ مقصود پہ بغیر راستے میں خراب ہوئے پہنچا دے گی۔

لیکن اس کے برعکس اگر آپ کے اندر خود غرضی، حسد، نفرت، خوف، حرص، کینہ پروری جیسی بُری اور ادنیٰ خصلتیں ہیں تو گویا آپ کے جسم میں غلط قسم کا ایندھن ہے وہ آپ کی گاڑی کو مشکل ہی سے منزل پہ پہنچائے گا اور راستے میں متعدد بار خراب ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیماری بیماریوں کے اسباب میں ہماری رذیل خصلتوں اور ہمارے کردار کی مذموم صفات کو بہت بڑا دخل ہے۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلی تقریر کی۔ اس میں آپ رضؓ نے فرمایا:

"کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جدوجہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر دے۔ اور کسی قوم میں فواحش پھیل جائیں اور خدا اسے عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔"

نیز آپؓ نے فرمایا جب دس ہزار فوج ہزار یا زیادہ فوج سے ہار جائے تو اس کی وجہ

ہمیشہ ان رہارنے والوں) کی بداعمالی ہوتی ہے۔"

سورہ الروم، آیات ۴۱ تا ۴۵ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے (یعنی ان کے اعمال کے باعث) خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے تاکہ (اللہ) انہیں مزہ چکھائے ان کے بعض اعمال کا شاید کہ وہ باز آئیں (اے نبی) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔ ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ پس (اے نبی) اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ اس دینِ راست کی سمت میں جما دو، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن لوگ پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے وہ اپنے ہی لیے فلاح کا راستہ صاف کر رہے ہیں تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور نیک اعمال کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے، یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔"

احکامِ اسلام کی پابندی کرنے کے اس دنیوی اور اخروی ثواب اور نافرمانی کرنے کے اس دنیوی اور اخروی عذاب کے پیشِ نظر ایک داعی کی انسان دوستی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کو ان اذیتوں سے بچانے اور ان راحتوں کا مستحق بنانے کی امکان بھر کوشش کر گزرے۔ اس کوشش میں استقامت بہت حد تک ہمدردی اور محبت پر منحصر ہوتی ہے۔ اپنا بچہ کبھی ہاتھ میں چاقو پکڑ لے تو ہم کس طرح بے قرار ہو ہو کر اس سے چاقو چھیننے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں اپنے آپ کو زخمی نہ کر لے۔ یہ فسق و فجور اور بداعمالیاں، یہ عریانیاں اور فحاشیاں، یہ طمع زر اور بددیانتیاں، یہ باہمی عداوتیں اور بے اتفاقیاں، یہ خدا سے بے پروائی اور شیطان سے وفاداریاں۔ یہ سب چاقو ہی تو ہیں جنہیں پکڑ کر انسان اپنے آپ کو زخموں سے چور کیے جا رہا ہے۔ جسے واقعی انسان سے محبت ہو گی، وہ ان چاقوؤں کو چھیننے کی کوشش ضرور کرے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ حضورؐ انسان کو راہِ راست پر لانے اور بداعمالیوں کے بُرے انجام سے بچانے کے لیے کس قدر بے چین رہا کرتے تھے۔ اس معاملے میں آپؐ کی بے قراری کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشعراء، آیت ۳ میں آپؐ کو

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے :

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (اے نبیؐ) شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے ۔

بخع کے اصلی معنی پوری طرح ذبح کر ڈالنے کے ہیں ۔ اس طرح باخع "نفسک" کے معنی یہ ہوئے کہ تم اپنے آپ کو قتل کیے دے رہے ہو ۔

سورۂ کہف ، رکوع اوّل ، آیت ۶ میں فرمایا ہے :

" (اے نبیؐ) اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے تو شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو ۔"

سورۂ فاطر رکوع دو ، آیت ۸ میں ارشاد فرمایا ہے :

" (اے نبیؐ) ان لوگوں کی حالت پر رنج و افسوس میں تمہاری جان نہ گھُلے ۔"

نبوّت سے سرفراز ہونے کے بعد سے لے کر رفیقِ اعلیٰ کے پاس واپس جانے کے وقت تک حضورؐ اسی کارِ معرز میں مصروف رہے کہ بھٹکے ہوئے آہو کو سُوئے حرم لے جاتے رہیں ۔

حضورؐ کا حجرہ مبارک مسجد کے ساتھ ملا ہوا تھا ۔ جس روز آپؐ کی وفات ہوئی صبح کے وقت آپؐ نے پردہ اٹھا کر مسجد کی طرف دیکھا ۔ لوگ فجر کی نماز میں مشغول تھے ۔ اپنی تیئیس سالہ شب و روز کی محنتِ شاقہ کے یہ شیریں نتائج دیکھ کر آپؐ فرطِ مسرّت سے ہنس دیئے ۔ یہ تھی صحیح معنوں میں انسان دوستی اور ایک داعی کے لیے اسی کی پیروی لازم ہے ۔

ایک بہت ہی بڑی آفت

عربی زبان میں ایک مختصر سی حکایت ہے کہ ایک شکاری نے چڑیاں پکڑیں اور پھر انہیں ذبح کرنے لگا۔ ذبح ہوتے ہوئے جب چڑیاں تڑپتی تھیں تو شکاری کا دل اتنا متاثر ہوتا تھا کہ وہ ساتھ ساتھ روبھی رہا تھا۔ چڑیوں میں سے کچھ بھولی بھالی چڑیوں نے کہا :

"اس شخص سے برائی کی توقع نہیں، دیکھو تو یہ ہماری تکلیف پر کس طرح زار زار رو رہا ہے ۔"

دوسری چڑیوں نے، جو اتنی بھولی نہیں تھیں، جواب دیا ۔ "کیا تم اس کی رونے والی آنکھوں کو دیکھ رہی ہو اور اس کے ذبح کرنے والے ہاتھوں کو نہیں دیکھ رہی ہو۔"

یہ حکایت اس وقت ہماری اُن تبلیغی جماعتوں اور دعوتِ دین دینے والے بعض افراد پر ٹھیک ٹھیک صادق آتی ہے جو ایک طرف تو نہایت خلوص اور نیک نیتی سے دین کی خدمت کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنی باہمی بے اتفاقی کے باعث دین کے جسم پر ایسی کاری ضربیں لگاتے ہیں کہ دشمن بھی نہ لگا سکیں۔ اب بھولے بھالے لوگ تو یہی کہیں گے کہ یہ نیک نیت لوگ دین کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ مگر جو اتنے بھولے بھالے نہیں وہ چلا اٹھتے ہیں کہ آخر اس خدمت کا فائدہ کیا ہے کہ ایک طرف تو خدمت ہو رہی ہے اور دوسری طرف آپس ہی میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ قائم کر کر کے اس خدمت کے اثرات کو خود ہی مٹایا جا رہا ہے۔

لہٰذا اس وقت جو لوگ واقعی خلوص دل سے دین کی سربلندی چاہتے ہیں، انہیں اپنے اندر دوسرے اوصاف کے علاوہ وہ وسیع النظری، وسعتِ قلب اور جذبۂ اتفاق باہمی پیدا کرنے کی خصوصی کوشش کرنی چاہیے جو انہیں اس قابل بنائے کہ وہ خود بھی بے اتفاقی

سے بچیں اور تسبیح کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو بھی باہم جوڑ سکیں۔

غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی تبلیغ دین کرنے والوں کی کوئی ایسی کمی نہیں۔ عالمِ اسلام میں عموماً اور پاکستان کے اندر خصوصاً بے شمار ایسی تنظیمیں کام کر رہی ہیں جن کا مقصد صرف خدمتِ دین ہی ہے اور ان تنظیموں میں بعض بڑے بڑے لائق اور دین کے مخلص خدمتگار بھی موجود ہیں اور وہ اپنے اپنے امکان کی حد تک دین کی سربلندی کے لیے انتہائی جدوجہد بھی کر رہے ہیں۔ مگر ان سب تنظیموں اور خادمانِ دین کی کوششوں کے جو نتائج نکلنا چاہئیں، وہ نہیں نکل رہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

بظاہر اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ سب جماعتیں اور افراد خدمت دین کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مخالفت کرنے کا "فریضہ" انجام دینے میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ ان تمام جماعتوں کے جاری کردہ رسائل اور کتب وغیرہ پر نگاہ ڈالیے تو پتہ چل جائے گا کہ ان کا کتنا وقت اور قوت اور وسائل دین پھیلانے کے بجائے آپس ہی میں ایک دوسرے کو دشمنانِ دین ثابت کرنے پر صرف ہو جاتے ہیں۔ کہیں بعض فقہی مسائل وجۂ اختلاف بن جاتے ہیں کہیں بعض سیاسی امور اور کہیں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوتی، بس مخالفت برائے مخالفت ہی چلتی چلی جاتی ہے۔ خدمت دین کے لیے زیادہ تنظیمیں قائم ہو جانا تو بظاہر کوئی ایسی بات نہیں جس سے دین کو نقصان پہنچے، اگر ہر تنظیم اسے اپنا فرضِ منصبی نہ قرار دے لے کہ ضرور ہی دوسری تنظیم کی مخالفت کرنا ہے چاہے مخالفت کی کوئی وزنی بنیاد ہو یا نہ ہو۔

عصر حاضر کی مختلف تبلیغی جماعتوں میں بہت سی جماعتیں ایسی ہیں جن کے عقائد، نظریات، مقاصد اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کردہ طریقوں، کسی میں بھی کوئی نمایاں اختلاف نہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں چلتے اور بڑی چھوٹی چھوٹی اور حقیر باتوں پر ایک دوسرے کو گمراہ قرار دینے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ اے کاش کہ یہ خادمانِ دین کبھی ٹھنڈے دل سے اس حقیقت پر غور کرنے کی کوشش کریں کہ ان کی باہمی بے اتفاقیوں نے دین کو کتنا زبردست نقصان پہنچایا ہے!

خدا ایک، رسولؐ ایک، دین ایک، کتاب ایک، ملت ایک، مقصد ایک، دین کی تمام

بنیادوں باتوں پر مکمل اتفاق رائے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فتنہ کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے جو ان ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف جانے والے مسافروں کو مل کر چلنے سے روک دیتا ہے! ان میں سے ہر ایک یہی اعلان کرتا ہے کہ منزلِ مقصود کی طرف صرف میرا رخ ہے دوسروں کا نہیں۔ اس لیے میں دوسروں کے ساتھ مل کر نہیں چلوں گا۔ چنانچہ وہ ایک ہی رخ پر جاتے ہوئے بھی ٹکڑیوں میں بٹ کر چلتے ہیں۔ اب اگر راستے میں کہیں کوئی ڈاکہ پڑے گا تو ڈاکوؤں کے لیے ان بکھری ہوئی ٹولیوں کو زیر کرنا اور لوٹنا بے حد آسان ہو گا۔ چاہے ان سب کی مجموعی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو!۔

کاش یہ بکھری ہوئی ٹکڑیاں آپس میں مل کر اور ایک دوسری کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چل سکتیں تاکہ حملہ آوروں کو ان پر حملہ کرنے سے پہلے دس مرتبہ سوچنا پڑتا۔ جب منزلِ مقصود ایک ہی ہے تو پھر کیا بات ہے کہ یہ مل کر نہیں چل سکتیں اور ہر قاطع راہ کے لیے کامیابی کے مواقع فراہم کر دیتی ہیں!

جس وقت کوئی ایسی دو تنظیمیں باہمی اختلافات اور ردّ و کد کا شکار ہوتی ہیں تو عجب ستم ظریفانہ صورتِ حالات پیدا ہو جاتی ہے کہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر بلند آہنگی سے خدا رسول ؐ کا نام لے رہے ہوتے ہیں۔

دونوں ہی پورا پورا الیقین رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور خدا کے رسول ؐ کے شیدا ہیں۔

دونوں ہی کو دعوےٰ ہوتا ہے کہ حق بات وہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔

دونوں ہی دین کی سربلندی کو اپنا مقصود بتاتے ہیں اور فی الواقع وہ اس کے لیے کام کر بھی رہے ہوتے ہیں۔

دونوں میں ایسے نیکوکار، نیک نیت اور پُرخلوص افراد پائے جاتے ہیں جنہوں نے اس راہ میں بڑی بڑی مالی، جسمانی اور جذباتی قربانیاں دے رکھی ہوتی ہیں۔

تو پھر آخر انہیں کیا ہو جاتا ہے کہ جو راہ انہیں اتنی محبوب ہوتی ہے اور جس پر چلتے ہوئے وہ اتنی سختیاں جھیل چکے ہوتے ہیں اور جھیل رہے ہوتے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کی مخالفتیں کر کر کے وہ اسی محبوب راہ میں کانٹے بکھیرتے جاتے ہیں!

یہ باہمی بے اتفاقی صرف مختلف تبلیغی جماعتوں ہی کے درمیان نہیں ہوتی بلکہ لبسا اوقات ایک ہی جماعت کے اندر کام کرنے والے افراد کے درمیان بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اس وقت یہ چیز اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ عموماً یہ افراد اپنی اپنی جگہ بڑے نیک نیت اور مخلص ہوتے ہیں مگر کبھی اپنی اپنی طبعی تیز مزاجی کے باعث اور کبھی کسی اور محرک کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی طرف سے دل میلا کر لیتے ہیں۔ یہاں بھی وہی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ افراد خدا، رسولؐ، دین اور آخرت ہی کے نام پہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جس خدا کا نام لے کر جمع ہوئے تھے، اسی کا نام پکارتے ہوئے ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں!۔

آخر جس خدا کے نام نے آپ کو جمع کیا تھا، اسی نے علیحدہ علیحدہ کیسے کر دیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ غلط فہمی میں ہوں۔ علیحدہ علیحدہ کرنے والا بظاہر خدا کا نام ہو اور درحقیقت اپنا نفس ہو!

یہ صورتِ حالات اتنی دردناک ہوتی ہے کہ قلم اسے لکھتے ہوئے بھی رُکتا ہے اور ایک عام سیدھا سادا دماغ پاگل ہو جاتا ہے کہ ان دونوں "حریفوں" میں سے کسے برسرِ حق سمجھے اور کسے برسرِ غلط یا کس سے ہمدردی کرے اور کس سے نہ کرے ؎

دل کو روؤں کہ میں جگر کو میرؔ
میری دونوں سے آشنائی ہے

دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خدا، رسولؐ پر قربان ہو رہے ہوتے ہیں۔ دونوں میں سے ہر ایک کا یہی خیال ہوتا ہے کہ میں دوسرے کا خیر خواہ ہوں اور دوسرا زیادتی کر رہا ہے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ یقین ہوتا ہے کہ دوسرے کا رویہ اصلاح طلب ہے اور میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہر ایک اسی خوش گمانی میں مبتلا ہوتا ہے کہ میں جو دوسرے پر اعتراضات کر رہا ہوں یہ صرف خیر خواہی کے باعث ہے تاکہ دوسرا اپنی اصلاح کر لے۔

ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ وہ دین کی سربلندی چاہتا ہے اور اسے سربلند کرنے ہی کے لیے "حق گوئی" سے کام لے رہا ہے۔

ہر ایک یہی اعلان کرتا ہے کہ اس کا مقصود صرف خدا کی رضا اور آخرت کی بہتری ہے۔ تو پھر جب دونوں ہی خدا کے عاشق ہیں اور دونوں ہی رسولؐ پہ فریفتہ ہیں، اور دونوں ہی ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں اور دونوں میں سے کوئی بھی زیادتی نہیں کر رہا اور دونوں ہی نیک نیت ہیں، اور دونوں ہی دین کی سربلندی چاہتے ہیں اور دونوں کا مقصود خدا کی رضا اور آخرت کی بہتری ہے تو پھر یہ باہمی بدظنی کے طوفان آخر کس بناء پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔!

مسلمانوں کی تاریخ میں جن چیزوں نے انہیں بے پناہ نقصان پہنچایا ہے، اُن میں ایک باہمی بے اتفاقی بھی ہے۔ انہوں نے بہت سی رسواکُن شکستیں ایسی کھائیں، جن کی وجہ یہ نہیں تھی کہ دشمن طاقتور تھا بلکہ یہ تھی کہ مسلمان اپنی باہمی بے اتفاقی کے باعث کمزور تھے۔ یہ بے اتفاقی جہاں بھی ہوگی، تباہی کا پیغام لائے گی۔ مگر جب بدقسمتی سے یہ بے اتفاقی دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت تو یہ شیطان کی اتنی بڑی فتح بن جاتی ہے کہ وہ اپنی کامیابی پر جتنا بھی نازاں ہو کم ہے۔

سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۵ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے"۔

سورہ آلِ عمران آیت ۱۰۳ میں حکم دیا گیا ہے:

"سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔"

سورۂ الانفال آیت ۴۶ میں تنبیہہ کی گئی ہے کہ:

"اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں۔ ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

کیا ان خادمانِ دین نے ان آیات کو کبھی نہیں پڑھا؟ یا اُن میں سے ہر ایک اسی گمان میں مبتلا ہے کہ ان آیات کے مخاطب دوسرے لوگ ہیں۔ وہ خود نہیں!

حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ کی راہ میں جو طرح طرح کی آفتیں آتی ہیں ان میں یہ آفت

بہت ہی بڑی ہے کہ اس راہ کے راہی آپس ہی میں ایک دوسرے سے بدظن ہو جائیں جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اپنی منزل مقصود کی طرف پوری توجہ دینے کے بجائے ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہو کر اس ذوقِ فضول میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو برسرِ حق اور دوسرے کو برسرِ غلط ثابت کر دیں۔

واضح رہے کہ اپنے آپ کو برسرِ حق اور دوسرے کو برسرِ غلط کہنا تو آسان ہے مگر اسے ثابت کرنا بے انتہا مشکل ہے۔ خصوصاً جب دونوں فریق ہی نیک نیت، نیک اطوار اور نیکوکار ہوں۔ عموماً دونوں میں سے کوئی بھی اپنے برسرِ حق اور دوسرے کے برسرِ غلط ہونے کے لیے کوئی ایسا قطعی ثبوت فراہم نہیں کر سکتا جس سے باقی سب مسلمانوں کی تسلی ہو جائے کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ بس وہ وقت ہی ہوتا ہے جو ضائع ہوتا چلا جاتا ہے اور مخالفین دین کو یہ کہنے کا مسلسل موقع ملتا رہتا ہے کہ دین پسند لوگ آپس میں متفق نہیں ہو سکتے۔ اور یہ تمام وقت اور یہ تمام طاقتیں جو اس باہمی ردّ و کد پر صرف ہوتی ہیں۔ اسی محبوب راہ سے کاٹی ہوئی ہوتی ہیں جس کے راہی ہونے پر انہیں فخر ہوتا ہے۔ اس طرح باہمی بدظنیوں میں اپنی قوتیں اور وسائل ضائع کرتے ہوئے بھی یہ بھولے لوگ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ حالانکہ دین اس وقت اپنے ان چاہنے والوں کے ہاتھوں زخموں سے چُور چُور ہو رہا ہوتا ہے۔

جب شیطان نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ :

"(اے میرے رب) مجھے اس دن تک مہلت دے جبکہ یہ سب دوبارہ اٹھائے جائیں گے"۔

تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ :

"تجھے مہلت دی جاتی ہے"۔

اس پر وہ انسان کا ازلی دشمن بولا :

"بس تو جیسا تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے، میں بھی اب تیری سیدھی راہ میں ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، پھر ان کے آگے سے آؤں گا اور ان کے پیچھے سے آؤں گا اور ان کی دائیں طرف سے آؤں گا اور ان کی بائیں طرف سے آؤں گا، اور تو

ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"

آگے اور پیچھے اور دائیں طرف اور بائیں طرف سے آنے سے شیطان کی جو کچھ بھی مراد ہو، یہ تو حقیقت ہے کہ وہ انسان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت ایک ماہر نفسیات کا سا رویہ اختیار کرتا ہے اور ہر انسان کو اپنے ڈھب پر لانے سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ یہ انسان ہے کس ڈھب کا، اور اس کی کونسی رگ کمزور ہے جسے پکڑ کر اسے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ جو لوگ آسانی سے کفر و الحاد اور فسق و فجور کی طرف آ سکتے ہوں، اُن کو تو وہ انہیں راہوں کے ذریعے دین سے دُور بھگا لے جاتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے عقائد و اعمال کی پختگی اور پاکیزگی کے باعث ان راہوں کی طرف کھنچے ہی نہ جا سکتے ہوں۔ ان کے لیے وہ ایسے پھندے تیار کرتا ہے جن کی ظاہری شکل دینداری ہی سے مشابہ ہو۔

کیا ہم دیکھتے نہیں کہ توحید پر ایمان رکھنے والے جا جا کر قبروں پہ سجدے کرتے ہیں، اور سمجھتے یہی ہیں کہ ہم بڑی دینداری کا کام کر رہے ہیں۔ ہماری اپنی تاریخ میں ایسے نام نہاد صوفیاد گزرے ہیں جنہوں نے شرعی عبادات کو بالائے طاق رکھ دیا اور یہ کہہ کر رکھا کہ اب خدا کی محبت نے ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں پہنچ کر ان رسمیات کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے محبّ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر دم تک اپنے آپ کو ان رسموں کا پابند رکھا۔

ان سطور میں جن خادمانِ دین کی باہمی بے اتفاقی کا ذکر ہے، اُن سے مراد وہ لوگ تو ہیں ہی نہیں جو یونہی شغلاً دعوتِ دین کا کام شروع کر دیتے ہیں اور پھر جب تک حالات درست رہتے ہیں دلچسپی لیتے رہتے ہیں مگر جونہی کوئی آزمائش آتی ہے، جان بچا کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ نہ وہ مراد ہیں جنہوں نے دین کے پردے میں دنیا کمانے کا ارادہ کر رکھا ہے بلکہ وہ نیک نیت، نیکوکار لوگ مراد ہیں جنہوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں دے رکھی ہیں، جو واقعی خدا، خدا کے رسولؐ اور خدا کے دین کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور جن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے کہ کہ اسلام سربلند ہو۔

ایسے بے لوث، نیک نفس انسانوں کو فسق و فجور یا دین کی مخالفت پر مائل کر لینا شیطان کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ تاہم اسے کسی نہ کسی طرح دعوتِ دین کو نقصان تو پہنچانا ہی ہوتا ہے، اس لیے وہ ایسے چکر چلاتا ہے جن سے ان خادمانِ دین کی توجہ اور وقت کو خدمتِ دین کے کام سے ہٹا کر کسی دوسری طرف صرف کروا سکے اور ان چکروں میں یہ چکر بڑا ہی خطرناک ہے کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے بدظنی پیدا کر دی جائے۔ ستم یہ ہے کہ اس باہمی بدظنی کی بنیاد عموماً یہی ہوتی ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے متعلق یہی اعتراض ہوتا ہے کہ اس کا طرزِ عمل دین کے احکام کے مطابق نہیں اور اس دین ہی کے غم میں باہم ردّ و کد کر کر کے یہ عاشقانِ دین اسی کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں جس کے غم میں نڈھال ہو رہے ہوتے ہیں۔

یہ صورتِ حالات جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی پیدا ہو جائے، اسے انسان کی سادہ لوحی اور شیطان کی عیاری اور ہوشیاری کا شاہکار سمجھنا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر اس مشکل کا حل کیا ہے۔ کیا یہ لازمی ہے کہ نیک نیت اور مخلص لوگ بھی ان بدظنیوں اور باہمی مخالفتوں کا شکار ہو کر ہی رہیں یا اللہ کے پاک کلام اور نبیؐ کی مقدس سنت میں ان بیماریوں کا علاج موجود ہے۔ بگرہم اس کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں کرتے۔

سورۃ الحجرات، آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"اے ایمان لانے والو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"۔

حضرت معاذ بن جبلؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک دن جب انہوں نے حضورؐ سے درخواست کی کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے جس کی وجہ سے میں جنت میں پہنچ جاؤں اور دوزخ سے دُور کر دیا جاؤں تو حضورؐ نے انہیں توحید، نماز، زکوٰۃ، رمضان کے روزوں اور بیت اللہ کے حج کی تلقین کی، اور خیرات، تہجد، جہاد وغیرہ کی فضیلت بتائی اور آخر میں آپؐ نے فرمایا:

"کیا میں تمہیں وہ چیز بھی نہ بتا دوں جس پہ گویا ان سب کا مدار ہے؟"

حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "کیوں نہیں یا رسول اللہؐ ضرور بتایئے"

آپؐ نے اپنی زبان پکڑ لی اور فرمایا: "اس کو روکو۔"

حضرت معاذ رضؓ نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہم جو باتیں کرتے ہیں کیا ان پر ہمیں مواخذہ ہوگا؟"

آپ ؐ نے فرمایا۔ "اے معاذ رضؓ! تیری ماں تجھے روئے، آدمیوں کو دوزخ میں ان کے منہ کے بل یا فرمایا کہ ان کی ناکوں کے بل، ان کی زبانوں کی بے باکانہ باتیں ہی تو ڈلوائیں گی۔"

(ترمذی)

سورۃ التغابن، آیت ۱۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"..... اور اگر تم عفو و درگذر سے کام لو اور معاف کردو تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔"

حضرت نعمان بن بشیر رضؓ سے روایت ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ایک دوسرے پر رحم کرنے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے میں اور ایک دوسرے پر مہربانی کرنے میں ایک جسم کی مانند ہیں کہ جب جسم کا کوئی ایک عضو کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو باقی تمام اعضاء بھی اس کے ساتھ جاگتے رہتے ہیں اور بخار میں مبتلا رہتے ہیں۔"

(بخاری و مسلم)

سورۃ الحجرات، آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پہ رحم کیا جائے گا۔"

مندرجہ بالا آیات اور احادیث پہ غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں وہ بنیادی اصول بیان کردیئے گئے ہیں جن کو پیش نظر رکھنے اور ذہن نشین کیے رہنے سے باہمی بے اتفاقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ داعیانِ راہِ حق اگر واقعی اس بات کے خواہشمند ہوں کہ وہ باہمی بے اتفاقی میں مبتلا ہو کر اپنی کوششوں کو خود ہی ضائع کرنے سے محفوظ رہیں تو انہیں ان اصولوں کو مشعلِ راہ بنانا ہوگا۔ ان پانچ فرمانوں میں جو پانچ اصول بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ بدگمانی سے بچنا۔

۲۔ زبان کی حفاظت کرنا۔

۳۔ ایک دوسرے کو معاف کرنا اور درگذر سے کام لینا۔

۴۔ مسلمان بہن بھائیوں سے سچی محبت اور ہمدردی رکھنا۔

۵۔ مسلمان بہن بھائیوں کے باہمی تعلقات درست رکھنے کی کوشش کرنا۔

بدگمانی سے پرہیز

انسانوں کے باہمی تعلقات کے بگڑنے میں بہت سا دخل اس بات کا ہوتا ہے کہ ایک انسان اپنے ساتھی کے بارے میں حسنِ ظن رکھنے کی شعوری کوشش نہیں کرتا اور جب حسنِ ظن کے لیے شعوری کوشش نہیں ہوتی تو بدظنی ہزار راستے سے اندر آجاتی ہے۔

انسان کسی دوسرے انسان کے دل کے اندر جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ اسے دوسرے کی نیک نیتی یا بدنیتی کا یقینی طور پر پتہ لگ سکے، وہ تو صرف اس کے ظاہری اعمال ہی سے اندازے لگاتا ہے اور ظاہری اعمال کے پیچھے ہزارہا ایسے محرکات کام کر رہے ہوتے ہیں جو دیکھنے والے کو نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلمند سے عقلمند انسان کے اندازے بھی غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔

ایک اصلاحی تحریک سے تعلق رکھنے والی خواتین جنگی بے گھروں کے لیے رقوم اور اشیاء جمع کر رہی تھیں۔ کسی عورت نے انہیں بالیوں کا ایک جوڑا اور چند اور زیورات لا کر دیئے تاکہ انہیں بیچ کر رقم کو ضرورت مندوں پر صرف کر لیا جائے۔ جو خاتون تنظیم کی خزانچی تھیں اور جن کی تحویل میں سب رقوم وغیرہ رہتی تھیں، اُن کی ایک بیٹی اتفاق سے انہیں دنوں سسرال سے ملنے آگئیں اور اس نے وہ بالیاں ماں سے خرید لیں۔ تنظیم کی ایک اور بڑی مخلص اور فعال خاتون نے جب خزانچی خاتون کی بیٹی کے کانوں میں وہ بالیاں دیکھیں تو اُن کے دل میں گرہ بیٹھ گئی کہ بالیاں انہوں نے اپنی بیٹی کو یونہی دے دی ہیں حالانکہ وہ خزانچی خاتون کو ایک عرصے سے جانتی تھیں اور ان کی امانت و دیانت شک و شبہ سے بالاتھی۔ اب صحیح طرزِ عمل تو یہی تھا کہ اگر ان کے دل میں شک پڑ ہی گیا تھا تو وہ مناسب انداز میں بات کر کے اپنا شک رفع کر لیتیں مگر انہوں نے لحاظ کے مارے خزانچی خاتون سے تو بات نہ کی اور اس شک کو دل ہی دل میں پالتی رہیں۔ پھر اس شک نے اُن کے دل اور ذہن پر اتنا زیادہ بوجھ ڈالا کہ انہوں نے تحریک کی چند اور خواتین سے دبی زبان میں کچھ بات بھی کر دی۔

بدقسمتی سے چند ہی ہفتوں کے بعد ایک اور ایسا واقعہ ہو گیا جس نے پہلے واقعے کی بنا پر پیدا ہونے والے شک کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ضرورت مندوں کے لیے کہیں سے کپڑے آئے جن میں ایک سلک کا سوٹ بھی تھا۔ اتفاق سے ٹھیک ویسے ہی کپڑے کا سوٹ اُن خزانچی خاتون کے پاس بھی تھا اور بدقسمتی سے انہوں نے انہیں دنوں میں کسی دن اسے پہن بھی لیا۔ اب تو شک کرنے والی خاتون کی بدظنی اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور کچھ دن کے بعد انہوں نے تحریک کی ایک میٹنگ میں یہ تجویز پیش کر دی کہ تنظیم کی رقوم کسی اور کی تحویل میں دے دی جائیں۔ چونکہ وہ چند ایک خواتین سے کچھ بات کر چکی تھیں، خزانچی خاتون کے کانوں میں بھی ان کے شک کی کچھ بھنک پڑ چکی تھی۔ اب جب یہ تجویز پیش کی گئی تو انہوں نے اس بات کو پہلی بات کے ساتھ جوڑ لیا اور سخت برافروختہ ہو گئیں کہ میری امانتداری پر شک کیا گیا ہے۔ اب یہ دونوں خواتین ہی اپنی اپنی جگہ بڑی مخلص اور فعال تھیں، اور ان واقعات سے پہلے ان کے درمیان تعلقات بھی اچھے تھے مگر اب ایسی تلخی پیدا ہو گئی کہ انجام کار سلام دعا تک بند ہو گئی۔

اب ان دونوں کے تعلقات جو خراب ہوئے وہ تو ہوئے ہی، باقی سب خواتین بھی دو دھڑوں میں بٹ گئیں۔ کوئی ایک کو سچا سمجھتی تھی کوئی دوسری کو، اور دیکھا جائے تو سچی دونوں ہی تھیں خزانچی خاتون تو سچی تھیں ہی، شک کرنے والی خاتون بھی اس لحاظ سے سچی تھیں کہ وہ پوری ایمانداری سے یہی سمجھتی تھیں کہ راہ خدا کے پیسے کو خرد بُرد ہونے سے بچانا ان کی ایمانداری کا تقاضا ہے۔ اب اگر وہ بدگمانیوں سے کام لینے کے بجائے شروع ہی میں تحقیق حال کر لیتیں اور بدگمانی کو دل سے نکال دیتیں تو حالات اتنے کیوں خراب ہوتے۔ مدتوں دونوں کے درمیان ردّوکد اور رنجش جاری رہی اور وقت اور توانائیاں بے چارے جنگی بے گھروں کی خدمت میں صرف ہونے کے بجائے بیکار ضائع ہوتی رہیں۔

ایک اور اصلاحی تحریک کا ایک سرگرم نوجوان کارکن صرف اس لیے تحریک کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا کہ ایک دن جب وہ اپنے ایک رشتے دار کو تحریک کی ایک فرقے دار ہستی سے ملانے کے لیے لے گیا تو وہ اس وقت شدید قسم کے سر درد میں مبتلا ہونے کے باعث اچھی طرح خیر مقدم نہ کر سکے۔ اب اس نوجوان کارکن کو اُن کے اس وقت تکلیف میں مبتلا ہونے

کا تو کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے ان کے طرزِ عمل کو سرد مہری پر محمول کرتے ہوئے یہ گمان کیا کہ چونکہ وہ مالی لحاظ سے غریب ہے اس لیے اس کے ساتھ آنے والے مہمان کو اہمیت نہیں دی گئی۔ کچھ دن کے بعد تحریک کی ایک میٹنگ میں اس نے کچھ تجاویز پیش کیں جو ناقابلِ عمل ہونے کے باعث منظور نہ کی گئیں۔ اس سے اس کے دل میں اور زیادہ پختہ طور پر یہ بات بیٹھ گئی کہ اُسے اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس نے دل برداشتہ ہو کر تحریک کے کام میں سرگرمی سے حصّہ لینا چھوڑ دیا۔ جب پر تحریک کی ذمہ دار ہستیوں نے اسے ٹوکا اور اعتراضات کیے تو اس کو بھی اس نے اُن کے ظلم پر محمول کیا اور آخر وہ تحریک کا ساتھ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ اب دیکھا جائے تو اس سارے معاملے میں ارادی طور پر قصور کسی کا بھی نہیں تھا سوائے اس کے کہ بدگمانی کے خلاف بند نہیں باندھا گیا تھا۔

یہ تو چند مثالیں ہیں، اَن گنت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ صرف بدگمانیوں کے باعث بڑے بڑے نیک نیّت اور نیکوکار لوگ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے اور اس کا اثر براہِ راست ان کی اصلاحی سرگرمیوں پر پڑا۔ بدگمانی کے خلاف اگر بند نہ باندھا جائے تو صبح شام میں ہزار باتیں ایسی پیدا ہو جاتی ہیں جو بدگمانی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقل و شعور اور صحیح دینی روح رکھنے والے بزرگوں نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ جب تک کسی کے خطا کار ہونے کا کوئی قطعی اور ناقابلِ تردید ثبوت نہ مل جائے، محض ظن اور گمان کی بناء پر کسی کے خلاف کوئی بُرا خیال دل میں نہ لایا جائے۔

امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں:

"جب تمہارے بھائی کی جانب سے تمہارے لیے کوئی ناپسندیدہ بات ظاہر ہو تو اس کے جواز کے لیے ایک سے ستّر تک اس کی تاویلیں تلاش کرو، اگر پھر بھی نہ ملے تو سمجھو کہ اس کا سبب اور اس کی کوئی تاویل ضرور ہو گی جس کا تمہیں علم نہیں۔"

نیز آپ نے فرمایا:

"اگر تم کسی مسلمان سے کوئی کلمہ سنو تو اسے بہتر سے بہتر معنی پر محمول کرو۔ جب وہ محمول نہ ہو سکے تو اپنے نفس کو ملامت کرو۔"

باہمی تعلقات کو درست رکھنے کے لیے ایک ضروری ہدایت یہ ہے کہ سنی سنائی باتوں پر قطعی کان نہ دھرا جائے۔ کیونکہ سنی سنائی باتیں اکثر و بیشتر غلط ہوتی ہیں۔ لیکن دل میں بدگمانی پیدا کر دیتی ہیں جو پھر مزید بدظنیوں کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جب کوئی شخص بات کا آغاز اس طرح کرے کہ "سنا گیا ہے کہ فلاں نے یوں اور یوں کہا ہے"، تو سمجھ جائیے کہ جو بات "سنا گیا ہے"، سے شروع ہوئی ہے، اس کے بالکل غلط ہونے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

خان لیاقت علی خاں مرحوم نے ایک دفعہ اپنی ایک تقریر میں لوگوں کو افواہیں سننے اور پھیلانے سے منع کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات بیان کی کہ ایک شخص کوئی شر انگیز بات کر رہا تھا۔ کسی ذمہ دار انسان نے اسے بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ بات کس سے سنی۔ اس نے کسی احمد کا نام بتایا۔ اُس احمد کو بلایا گیا اور پوچھا گیا کہ بھئی تم نے یہ بات کہاں سے سنی۔ اس نے کسی محمود کا نام بتایا۔ اب محمود کو بلایا گیا تو اس نے کسی زید کا نام لے دیا۔ جب اس زید کو طلب کر کے سوال کیا گیا کہ تم نے یہ بات کس سے سنی، تو وہ کہنے لگا۔ "صاحب یہ بات تو عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔" اس ذمہ دار شخص نے کہا کہ "بس اسی کو پکڑ لو، اسی نے یہ بات گھڑی ہے جو کسی سنانے والے کا نام نہیں بتا سکا!"

جب بدقسمتی سے دو انسانوں کے باہمی تعلقات میں کچھ خرابی آ جاتی ہے تو پھر وہ لوگ جو آ کر ایک کی بات دوسرے کو، اور دوسرے کی پہلے کو بتاتے ہیں، اس خرابی کو اور زیادہ بڑھانے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس بات سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے کہ ایسی صورت حالات میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کی بات دوسرے سے کی جائے۔

لہٰذا راہِ حق کے داعیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ حتی الامکان بدگمانی سے بچیں اور سنی سنائی بات پر نہ خود یقین کریں اور نہ اُسے آگے چلائیں۔ اگر وہ صرف اسی ایک اصول کی پوری پابندی کر لیں تو باہمی بے اتفاقی کے خدشے کا بہت حد تک تدارک ہو جائے گا۔

یاد رکھیے کہ جس مالک نے حکم دیا ہے کہ!

"زیادہ گمان نہ کرو، بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔"

..... وہ انسان کا خالق ہے اور اسے سب سے زیادہ اس بات کا پتہ ہے کہ اس نے انسان کے گمان کو کتنی اونچی پرواز عطا کر رکھی ہے ۔

صرف اسی ایک مختصر سے حکم سے بے پروائی برتنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں رائی کے پہاڑ بنا بنا کر اپنے درمیان اختلافات کی خلیجیں حائل کر لیتے ہیں ۔حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

"بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے ۔" (بخاری، مسلم)

زبان کی حفاظت

عربی کا ایک شعر ہے :

مُتْ بِدَاءِ الصَّمْتِ خَيْرٌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مِنْهُ مِنْ دَاءِ الْكَلَامِ

(تو خاموشی کی بیماری سے مرجائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تو بولنے کی بیماری سے مرے)

دنیا میں بہت سی آفتیں اور باہمی تعلقات میں خرابیاں صرف اس وجہ سے آتی ہیں کہ ہم زبانوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں کہ جو دل میں آئے بولتی چلی جائیں ۔ غیبت کرنا ، بہتان لگانا ، لوگوں کو برا بھلا کہنا ، کسی کا مضحکہ اڑانا ، طعن و تشنیع سے کام لینا ۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو انسانوں کے درمیان افتراق اور دشمنیاں پیدا کرتی ہیں اور ان سب کے اظہار کا ذریعہ زبان ہی ہے ۔ ایک زبان کو انسان لگام دے لے اور اسے سوچ سمجھ کر استعمال کرے تو خرابی کے بہت سے دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ دلوں میں جو بدظنی پیدا ہوتی ہے ، وہ بھی زیادہ خرابی کا باعث اسی وقت بنتی ہے جب زبان اُن کا اظہار شروع کر دیتی ہے ۔

بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ دوسروں کو نیکی کی طرف بلائیں ، وہ خود بھلا ایسے ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں ۔ مگر یہاں بھی ، جیسے کہ پہلے بیان ہو چکا ، شیطان دینداری کا فریب دے کر ہی دین کے خلاف عمل کرا لیتا ہے ۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رحؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" میں مختلف اخلاقی بیماریوں کے اسباب کی تحقیق کی ہے اور پھر اُن کے علاج لکھے ہیں ۔ اس سلسلے میں آپ

نے غیبت کے اسباب پر بھی بحث کی ہے ۔ یہاں صرف اس کے خلاصے کو سمجھ لینا مفید ہوگا حجۃ الاسلام فرماتے ہیں کہ غیبت کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں مثلاً :

۱ ۔ انسان کو جب کسی شخص کی بات پر غصہ آتا ہے اور وہ اس غصے کو ضبط نہیں کرسکتا تو خواہ مخواہ اس شخص کے عیوب زبان پر آنے لگتے ہیں ۔ اب اگر کسی وجہ سے وہ اس غصے کا اظہار نہ کرسکے تو غصہ دل میں گھٹ کر رہ جاتا ہے اور ہمیشہ اس شخص کو غیبت پر آمادہ کرتا رہتا ہے ۔

۲ ۔ انسان کو جب اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اسے بدنام کرنا چاہتا ہے تو حفظِ ماتقدم کے لیے وہ پہلے خود اس کے عیوب ظاہر کرنا شروع کر دیتا ہے ۔

۳ ۔ کسی مجلس میں جب پہلے ہی سے کسی کی غیبت ہو رہی ہو تو نئے آدمی کو بھی خواہ مخواہ اس میں شریک ہونا پڑتا ہے کیونکہ اگر وہ ان کو ٹوکے یا چپکے بیٹھا رہے تو تمام لوگوں پر بار ہوتا ہے ۔

۴ ۔ انسان پر جب کوئی غلط الزام لگایا جاتا ہے اور وہ اس سے اپنی برأت ثابت کرنا چاہتا ہے تو اس شخص کا نام لے لیتا ہے جو اس الزام کا مرتکب ہوتا ہے حالانکہ اس کو صرف اس کی اپنی برأت پر قناعت کرنی چاہیے تھی ۔

۵ ۔ اپنا کمال ثابت کرنے کے لیے دوسرے کی تنقیص کی جاتی ہے ۔ مثلاً ایک شاعر دوسرے شاعر کی نسبت کہتا ہے کہ اس کا کلام نہایت بدمزہ ہوتا ہے ۔ یہ کہنے سے درپردہ غرض یہ ہوتی ہے کہ میرا کلام نہایت بامزہ اور لطیف ہے ۔

۶ ۔ کسی کی عزت اور شہرت سے جی جلتا ہے تو لوگوں کے دلوں سے اس کی وقعت کم کرنے کے لیے اس کے عیوب بیان کیے جاتے ہیں ۔

۷ ۔ محض مذاق اور دل بہلانے کے لیے دوسروں کے عیبوں کا خاکہ اڑایا جاتا ہے ۔

۸ ۔ کسی کا تمسخر یا استہزا مقصود ہوتا ہے ۔

۹ ۔ کوئی دیندار آدمی جب کسی کو کوئی بُرا کام کرتے دیکھتا ہے تو اسے تعجب ہوتا ہے اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس شخص کا نام زبان پر آجاتا ہے ۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ زید نے باوجود کمال کا دیندار ہونے کے ناچ کی محفل میں شرکت کیسے کی ۔

۱۰ ۔ لبعض اوقات کسی اچھے آدمی کو کوئی گناہ کرتے دیکھ کر اس پر رحم اور افسوس آتا ہے اور

کہا جاتا ہے کہ افسوس زید نے شراب پینی شروع کر دی ہے جو اس کے رتبے اور شان کے خلاف ہے۔

۱۱۔ بعض اوقات دل میں جذبہ یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو اچھی باتوں کی طرف بلائیں اور اس سلسلے میں کسی گناہ کا ارتکاب کرنے والے شخص کا نام لے کر یہ جذبہ ظاہر کیا جاتا ہے۔

ان گیارہ اسباب .... میں سے پہلے آٹھ اسباب کے بارے میں حجۃ الاسلام فرماتے ہیں کہ ان کا تعلق عام لوگوں سے ہے اور آخری تین اسباب کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ ان کا تعلق مذہبی گروہوں سے ہے۔ پھر ان تینوں اسباب پہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان تینوں صورتوں میں غیبت کرنے والے کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ میں غیبت کا ارتکاب نہیں کر رہا بلکہ ایک مذہبی فریضہ ادا کر رہا ہوں حالانکہ اس فرض کے ادا کرنے میں کسی شخص کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"

حجۃ الاسلام کا یہ بیان ایک طرف تو یہ واضح کرتا ہے کہ غیبت جن جن اسباب ..... سے ہوتی ہے، ان اسباب کو ختم کیا جائے اور دوسری طرف بڑی خوبصورتی سے اس حقیقت کی عکاسی کر دیتا ہے کہ کس طرح بعض اوقات دیندار لوگ بھی کرتے تو غیبت ہی ہیں مگر ہوتے اس غلط فہمی میں ہیں کہ ہم تو لوگوں کو بُرے اعمال سے بچے رہنے کی ہدایت کر رہے ہیں۔ حالانکہ لوگوں کو بُرے اعمال سے بچنے کی ہدایت کرنے کے لیے اس کی قطعی کوئی ضرورت نہیں کہ لوگوں کے نام لے لے کر ان کے عیب بیان کیے جائیں۔ اور اس طرح معاشرے میں انہیں رسوا کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

اب اگر ایسا ہی طرزِ عمل اپنے کسی ساتھی کے بارے میں اختیار کیا گیا تو جب بات اس کے کانوں میں پہنچے گی تو اس کا دل دُور ہی ہوگا قریب تو نہیں آئے گا۔ نتیجہ وہی ہُوا کہ زبان کی حفاظت نہ کر کے اپنی ہی صفوں میں انتشار پیدا کیا۔ امام غزالیؒ نے غیبت کے جتنے اسباب یہاں بیان کیے ہیں، ان سب پر غور کر کے دیکھنا چاہیے کہ ان میں کوئی ایک سبب بھی ایسا ہے جو اس شخص کے شایانِ شان ہو سکے جو دوسروں کو نیکی کی طرف بلانا چاہ رہا ہے۔

غیبت کے بارے میں ایک عجیب منطق اور سنی جاتی ہے کہ بعض لوگ اسے غیبت کہنے کے بجائے "دور اندیشی" کا نام دیتے ہیں۔ جب انہیں غیبت کرنے پر ٹوکا جائے تو وہ کہتے ہیں ہمارا مطلب کسی کی برائی کرنا ہرگز نہیں، ہم تو دور اندیشی کر رہے ہیں کہ فلاں شخص ایسے اور ایسے کیوں کرتا ہے،

بلکہ ایسا کرنے سے اس کی دنیا کی عزت بھی خطرے میں ہے اور آخرت میں بھی عذاب ملے گا ـــــ یہ دُور اندیش شخص اس شخص کا تو واقعی خیر اندیش ہوتا ہے جس کی وہ برائی کر رہا ہوتا ہے مگر خود اپنا بد اندیش ہو جاتا ہے کیونکہ جو شخص کسی کی غیبت کرے اس نے زندگی میں جو نیکیاں کی ہوتی ہیں، وہ اس شخص کو مل جاتی ہیں جس کی وہ برائی کر رہا ہوتا ہے۔

خواجہ حسن بصریؒ کو ایک دفعہ خبر پہنچی کہ فلاں شخص نے آپ کی غیبت کی ہے۔ آپ نے کھجوروں کا ایک طبق اس کے پاس بطور ہدیہ بھیجا اور ساتھ ہی یہ پیغام دیا کہ "مجھ کو یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں منتقل کر دی ہیں۔ اس احسان کا بدلہ دینے کی مجھ میں استطاعت نہیں ہے، اس لیے صرف یہ کھجوریں نذر کرنے پہ اکتفا کرتا ہوں۔"

کیا مضحکہ خیز بات ہے کہ انسان محنت کر کے نیکیاں کمائے اور پھر حوالے اس کے کر دے جو اچھا نہ لگتا ہو۔

پھر یہ بھی ہے کہ دوسروں کی خرابیاں عموماً اُسی وقت زیادہ نظر آتی ہیں جب انسان خود اپنے عیوب کی طرف توجہ نہ رکھے۔ اگر زیادہ توجہ اپنی اصلاح کی طرف رہے تو پھر ساتھیوں کے نقائص زیادہ نظر بھی نہیں آتے۔ ایک شخص نے حضرت ذوالنونؒ مصری سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی وصیت کیجئے جو ہمیشہ میرے کام آتی رہے۔ انہوں نے فرمایا:

"بس یہ خیال رکھنا کہ کہیں لوگوں کے عیوب کی چھان بین تم کو اپنے عیبوں پہ نظر ڈالنے سے غافل نہ کر دے۔"

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر ہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خطاؤں پہ جو نہی نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

مومن کے کردار کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک زبان کا محتاط استعمال ہے۔ باتیں جتنی زیادہ کی جائیں گی، ناپسندیدہ باتیں کر جانے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے جائیں گے۔ بکر بن عبداللہ تابعیؒ کا مقولہ ہے:

"زیادہ باتیں نہ کیا کرو، اگر تم نے صحیح اور درست باتیں کیں تو اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا،

اور اگر غلط کیں تو تم سے اُن کا مواخذہ ہوگا۔"   (ابن سعدؓ)

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں: "مصیبت کی جڑ بنیاد انسان کی گفتگو ہے"،
آپؓ اپنی زبان کی نوک کو بار بار پکڑتے اور فرماتے:
"اس نے بہت جگہ پھنسایا"
حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: "عقل مند کی زبان دل کے پیچھے ہے، جب وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو پہلے دل کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر وہ بات اس کے فائدے کی ہوتی ہے تو کہتا ہے، ورنہ رُک جاتا ہے۔ اور جاہل کا دل اس کی زبان کی نوک پر رہتا ہے، وہ دل کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ جو کچھ زبان پر آتا ہے بول جاتا ہے۔"

عفو و درگذر

اگرچہ باہمی تعلقات اکثر غلط فہمیوں اور بے بنیاد بدگمانیوں کی بنا پر خراب ہوتے ہیں۔ تاہم چونکہ شیطان ہر دم انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ آپ ایک لمحے کے لیے فرض کر لیں کہ راہِ حق کی طرف بلانے والوں میں سے کسی ایک ساتھی نے کسی دوسرے سے کوئی بدسلوکی کر ہی لی۔ زبان سے اس کا دل دکھایا یا کوئی اور عمل ہی ایسا کیا جس سے اُسے تکلیف پہنچی —— تو کیا اب دوسرا ساتھی مشتعل ہو جائے؟ اور "عزتِ نفس" اور "غیرت" کے چکروں میں پڑ کر شکوے شکایتوں اور ردّ و کد میں وقت ضائع کرنا شروع کر دے؟ جس کی "غیرت"، اور "عزتِ نفس" ایسی ہی چھوئی موئی کا پودا ہوگی، اس کے لیے تو تبلیغ کی راہ پر چلنا محال ہو جائے گا۔ یہاں تو مالی، جسمانی، قلبی، ذہنی ہر قسم کی اذیتوں کو سہنے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ انسان ذرا سی بات بھی نہ سہہ سکے۔

بعض بہنوں اور بھائیوں کی یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ جن لوگوں پر تبلیغ کرتے ہیں اُن کے تو ہر طرح کے طعن و تشنیع اور بدسلوکی خندہ پیشانی اور عالی ظرفی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی ذرا سی بات بھی نہیں سہہ سکتے، اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ چونکہ دوسروں کو دین کی دعوت دینے کا فریضہ ادا کر رہے ہیں،

انہیں تو ایسا اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

اس کا جواب صرف یہ ہے کہ جو اصول آپ اپنے ساتھیوں کے لیے قائم کر رہے ہیں۔ اُن کا اطلاق خود آپ کے اپنے اُوپر بھی ہوتا ہے، کیونکہ آپ بھی تو اُسی راہ کے مسافر ہیں۔ اگر دوسرے نے وہ نہیں کیا جو اُسے کرنا چاہیئے تھا تو آپ تو کریں۔

سوچا جائے تو یہ بھی شیطان کا چلایا ہوُا ایک حربہ ہوتا ہے کہ انسان دینداری کا تقاضا سمجھتے ہوئے اپنی ذہنیت ایسی بنا لے کہ اُن لوگوں کو تو معاف کرنے کے لیے تیار رہے جنہیں وہ ہم خیال بنانا چاہتا ہو، مگر جو ہم خیال ہیں، انہیں بخشنے کے لیے تیار نہ ہو۔ حالانکہ سوچا جائے تو وہ عفو و درگذر کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ ایک مقدس راہ میں ہمارے ساتھی ہیں۔

سورۂ حٰم السجدہ آیات ۳۴، ۳۵، ۳۶ میں ارشاد ہوُا ہے:

"اور (اے نبیؐ) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی، مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا، مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

سید سلیمان ندوی ان آیات کو بیان کر کے فرماتے ہیں:

"آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے، وہ شیطانی کام ہے۔ اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا۔ خدا نے آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا، اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا، اور بُرائی کے مقابلے میں عفو و درگذر کا حکم دیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔"

دین کی دعوت دینے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ باتیں صرف لوگوں کو تشریح

کر کر کے سمجھانے ہی کے لیے نہیں، خود عمل کرنے کے لیے بھی ہیں۔

عفو و درگذر کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ مشکل ترین کاموں میں سے ہے۔ لیکن اگر انسان یہ یاد کر لے کہ یہ غصّہ جو مجھے آرہا ہے، شیطان کی طرف سے ہے، اور دل کو بدلنے کی کوشش کرے تو خدا کی توفیق سے یہی مشکل ترین کام آسان ترین بھی بن سکتا ہے۔ اتنا ہی سوچ لینا چاہیے کہ آخر ہمارے کسی ساتھی نے ہمیں قتل تو نہیں کر دیا۔ نہ وہ ہمیں مارپیٹ رہا ہے، نہ اس نے ہمارے رزق کا دروازہ بند کیا ہے۔ بس اتنا ہی ہے نا کہ اس نے کوئی دل دُکھانے والی بات کہہ دی ہے۔ تو زبانوں سے تو انبیاءؑ بھی نہ بچے، بڑے بڑے اولیاءؒ بھی نہ بچے، ہمارا رتبہ کیا نعوذ باللہ، اُن سے بھی اونچا ہو گیا ہے کہ ہم آپے سے باہر ہو جائیں کہ آخر ہماری شان کے خلاف کسی نے زبان ہلائی کیوں! —— یقین کرنا چاہیے کہ اگر انسان دل کو اس طرح سمجھائے تو انسانی دل اتنا بُرا نہیں جتنا اُسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بات کو سمجھ بھی لیتا ہے اور جب وہ صحیح بات کو سمجھ لے تو پھر عفو و درگذر میں اس کے لیے راحت ہی راحت ہے۔

دل کو عفو و درگذر کی طرف مائل کرنے کے لیے اُن نیکوکار ہستیوں کے حالات کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا، جنہوں نے توفیقِ ایزدی اپنے دلوں کو ایسا عالی ظرف بنا لیا تھا کہ انہیں عفو و درگذر ہی میں سکون ملتا تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جو شخص عفو و درگذر سے کام لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہی ہے۔" (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کی کہ مجھے نصیحت کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "غصّہ نہ کیا کر"۔

اس نے بار بار یہی الفاظ دہرائے (کہ مجھے نصیحت کیجیے) اور آپؐ نے بار بار یہی فرمایا۔ "غصّہ نہ کیا کر"۔ (بخاری)

ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو کسی نے نا ملائم کلمات کہے۔ آپ جواب میں چپ

رہے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کیوں چپ ہیں۔ فرمایا کہ خدا کے خوف نے منہ میں لگام لگا دی ہے۔

ایک دفعہ دو شخص سرِراہ لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تو مجھے ایک کہے گا تو مجھ سے دس سُنے گا۔ اتفاق سے مولانا روم رح ادھر سے گزرے۔ آپ نے اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا " بھائی جو کچھ کہنا چاہتے ہو، مجھے کہہ لو۔ مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے"۔

حضرت امام حسن رضؓ کو ایک بدّو نے مجمع عام میں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ لوگوں کو اس پر غصّہ آیا تو آپؓ نے فرمایا کہ "وہ تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہا، مجھ ہی کو کہہ رہا ہے۔"

پھر آپ نے فرمایا کہ "غریب بھوکا ہوگا، کھانا کھلاؤ، عمدہ کپڑے دو، خرچ سے تنگ ہوگا، روپے دو۔"

غرضیکہ آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ تیسرے دن اس شخص کو بلا کر فرمایا۔ "کیوں بھائی اب بھی تم مجھ سے خفا ہو"۔

وہ شخص یہ سن کر رو پڑا اور کہا کہ میں نہ پہلے خفا تھا نہ اب ہوں۔ میں تو صرف امتحان لے رہا تھا کہ دیکھوں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا خون آپ میں کس قدر ہے۔

آپ رضؓ نے فرمایا۔ "الحمد للہ ہم پہاڑ ہیں، ایسے جھونکوں سے ہلنے والے نہیں۔"

عفو و درگزر میں دہرا فائدہ ہے۔ اپنے دل میں صبر اور عالی ظرفی پیدا ہوتی ہے۔ اور ساتھیوں کے ساتھ الفت و محبت قائم رہتی ہے۔ اگر ہم تہیہ کر لیں کہ اپنی محبت میں کمی نہ آنے دیں گے تو آخر کوئی کہاں تک اپنی ناراضی کو قائم رکھ سکے گا۔ پہاڑ بننے میں جو وقار اور سکون قلب ہے وہ اس چھوٹی سی ہری ٹہنی بنتے میں کہاں، جو ذرا سے ہوا کے جھونکے سے لہرانا اور تلملانا شروع کر دیتی ہے۔

باہمی محبّت

حضرت نعمان بن بشیر رضؓ کی بیان کردہ مندرجہ بالا احادیث میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

نے مسلمانوں کو ایک جسم سے تشبیہہ دی ہے۔ جس کا ایک عضو اگر تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو باقی سب اعضاء اس کے ساتھ جاگتے اور بخار میں مبتلا رہتے ہیں۔ باوجودیکہ مسلمانوں کی دینی حس بے انتہا کمزور ہو چکی ہے۔ جہاں تک دوسرے مسلمان ممالک کے دُکھ پر دُکھی ہونے اور سُکھ پر خوش ہونے کا تعلق ہے، مسلمانوں، کم از کم پاکستان کے مسلمانوں کی کسی حد تک اب بھی وہی کیفیت ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصّے کے مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران میں پاکستانی مسلمانوں کی بے چینی کا وہ عالم تھا کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ غم اور بے چینی کی شدت کے باعث بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے تھے۔ ہر ایک کو اسی بات کی تلاش رہتی تھی کہ کوئی اسے جنگ کے بارے میں کوئی ایسی امید افزا بات سنائے جس سے اس کے دل کو تسلّی ہو۔ ان دنوں عجب قابلِ رحم مناظر دیکھنے میں آتے تھے۔ ایک جگہ دو اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین غم و الم میں ڈوبی جنگ ہی کا ذکر کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے منت کے انداز میں دوسری کی طرف دیکھ کر کہا:

"عرب جیت جائیں گے نا؟"

دوسری نے جواب دیا: "بس خدا ہی کی طرف دھیان رکھیں اور اسی سے التجا کریں فتح و شکست تو اسی کے ہاتھ میں ہے"

پہلی نے کہا: "بھلا وہ کیوں نہ جیتیں گے۔ کیا وہ حق پر نہیں ہیں؟"

دوسری بولی: "انشاء اللہ جیتیں گے۔ آخر وہ اپنا حق ہی مانگ رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ سے دعا تو مسلسل کرتے ہی رہنا چاہیے"

ایک تسلّی چاہ رہی تھی، دوسری تسلّی دے رہی تھی۔ مگر دونوں کے چہروں پر وہ کرب تھا جو صاف بتا رہا تھا کہ تسلّی دل کسی کو بھی نہیں رہی۔

بازاروں میں یہ حال تھا کہ جیسے ہی ریڈیو خبریں سنانا شروع کرتا دکاندار بیچنا اور خریدار خریدنا چھوڑ کر سہمے ہوئے چہروں کے ساتھ ریڈیو کی طرف مڑ جاتے۔

چند دن کے اندر ہی ایسے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے کہ اب عرب شکست کھا جائیں گے۔ لیکن اگر ایک کے منہ سے یہ بات نکلتی تھی تو دوسرا اس سے لڑنا شروع کر دیتا تھا کہ تم نے یہ بُری بات آخر منہ سے نکالی کیوں؟ اور پھر جب عرب ہار ہی گئے تو پاکستان میں گھر گھر جیسے ماتم کی صف بچھ گئی ہو۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب ہم کیا کریں! کبھی وہ اسرائیل اور امریکہ کو بُرا بھلا کہنے لگتے اور کبھی عربوں کی محبت میں خود عربوں ہی پر پل پڑتے کہ انہوں نے ایسے کیوں کیا اور ویسے کیوں کیا۔ تبھی تو یہ ہارے ہیں۔

ایک تعلیمی ادارے میں کچھ خواتین پروفیسر بیٹھی جنگ ہی پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ ان میں سے دو نے آپس ہی میں ردّ و کدّ شروع کر دی۔ ایک ناصر کی پالیسی پہ نکتہ چینی کر رہی تھی۔ دوسری اس کی حمایت میں بول رہی تھی۔ بحث میں خاصی تلخی پیدا ہو گئی۔ ناصر کی حمایت یا مخالفت کسی کا بھی مقصود نہیں تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ جو غم ان کے سینوں میں سما نہیں رہا تھا، اُسے وہ تلخ گفتگو کی شکل میں کسی نہ کسی طرح باہر نکالنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ جب معاملہ شدید تلخ کلامی تک پہنچنے لگا تو پاس ہی سے کوئی تیسری بول اٹھی۔

"خدا کے لیے اس بحث بازی کو چھوڑ دو۔ تمہارے درمیان اس وقت درحقیقت کوئی اختلاف ہے ہی نہیں بلکہ ایک مشترکہ غم تم سے برداشت نہیں ہو رہا اور تم خواہ مخواہ ایک دوسری سے الجھ رہی ہو۔"

کیونکہ اصل حقیقت یہی تھی۔ دونوں ایک دم خاموش ہو گئیں اور دونوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

حد یہ ہے کہ بڑے بڑے الٹرا ماڈرن لوگ جو عام حالات میں شاید ہی کبھی خدا، رسولؐ اور دین کا نام لیتے ہوں، غم میں چُور دیکھے گئے۔ ان سے اگر پوچھا جاتا کہ بھئی جب تمہیں سرے سے اس بندھن ہی سے محبت نہیں جس نے تمہیں عربوں سے باندھ رکھا ہے تو پھر عرب جیتیں یا ہاریں، تمہارا ان سے تعلق؟ —— تو ان کے پاس اس بات کا جواب تو کوئی نہ ہوتا مگر یہ بات اُن کے غم کو کم نہ کرتی۔

یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ عالمِ اسلام میں جہاں کہیں بھی کسی مسلمان قوم کو کوئی تکلیف

پہنچے پاکستان کا مسلمان بلبلا اٹھتا ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے جو کم از کم پاکستان کے معاملے میں بڑا روشن ہے مگر افسوس کہ تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ بڑا تاریک ہے ـــــ وہ یہ ہے کہ وہی لوگ جو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے اتنی محبت رکھتے ہیں، خود اپنے قریبی ماحول میں بالکل بھول جاتے ہیں کہ یہاں بھی اسلامی اخوّت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے سلسلے میں ہے۔ اپنا رشتہ دار، اپنا ساتھی، اپنا ہمسایہ، اپنا محلّہ دار، ان کے بارے میں تو شاید کبھی سوچا بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی ہماری قلبی الفت و محبت اور عفو و درگذر کے حقدار ہیں۔ رشتے دار صرف رشتے دار ہے، ساتھی صرف ساتھی، ہمسایہ صرف ہمسایہ اور محلّہ دار صرف محلہ دار۔ یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ یہ لوگ اپنی رشتے داری، ہمسائگی اور محلّہ داری کے علاوہ مسلمان بہن بھائی بھی ہیں، جن کے متعلق حضورؐ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ "جس شخص نے کسی مومن کی دنیوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی، اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی سختیوں میں سے کوئی سختی دور فرمائے گا۔ اور جس نے کسی تنگ دست پر آسانی کی، حق تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا۔ اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی۔ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی عیب پوشی کرے گا اور جب تک بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کی امداد فرماتا رہتا ہے۔"

(مسلم، بروایت حضرت ابو ہریرہؓ)

اس سارے بیان سے جو کچھ مراد ہے وہ یہ ہے کہ وہی اسلامی اخوّت جو دوسرے ممالک کے لیے، کم از کم پاکستان میں اب بھی قائم ہے، اسے وسیع تر کرتے ہوئے اپنے قریب ماحول تک محیط کرنے کی ضرورت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

"ایک دوسرے سے حسد نہ کرو،
اور نہ ایک دوسرے کے مقابلے میں قیمتیں بڑھاؤ،
اور نہ ایک دوسرے سے بُغض رکھو،
اور نہ ایک دوسرے سے روگردانی کرو،

اور نہ ایک دوسرے کی خرید و فروخت پر خرید و فروخت کرو،
اور اے اللہ کے بندو، آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ،
مسلمان مسلمان کا بھائی ہے،
پس نہ وہ اپنے بھائی پر ظلم کرے،
اور نہ اُسے حقیر جانے،
اور نہ اُسے بے یار و مددگار چھوڑے،"

اور تین مرتبہ اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ "تقویٰ کا تعلق اس جگہ سے ہے۔ کسی آدمی کو اتنی ہی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور آبرو حرام ہے۔"

(مسلم، بروایت ابوہریرہؓ)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ نصیحتیں فرمائی تھیں تو آپؐ نے ان میں سے قریبی ماحول کو خارج نہیں فرمایا تھا۔
راہِ حق کی طرف بلانے والوں کے دلوں میں بھی اگر اپنے قریبیوں اور ساتھ کام کرنے والوں کے لیے اتنی ہی گہری محبت ہوگی جتنی کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے دلوں میں پیدا کرنا چاہی تھی تو انشاء اللہ باہمی تعلقات میں خوشگواری ہی خوشگواری رہے گی۔
واضح رہے کہ دلوں میں بدگمانی کا پیدا ہو جانا، ساتھی کی تنقیص کو جی چاہنا اور دل کا معاف کرنے پر آمادہ نہ ہونا محبت کی کمی ہی کے باعث ہوتا ہے۔ جامعہ اشرفیہ کے بانی مولانا مفتی محمد حسنؒ فرماتے ہیں:

"دل میں اگر محبت ہوگی تو محبت کا دربان شکوک کو اندر نہیں گھسنے دے گا!"

سورۂ الفتح آیت ۲۹ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ہیں یعنی آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحیم اور شفیق ہیں۔ باہمی تعلقات کو درست رکھنے کے لیے رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ بننا انتہائی ضروری ہے۔

صلح کرنا اور صلح کرانا

کلامِ پاک اور حدیث مقدس کے بیان کردہ مندرجہ بالا پانچ احکام میں سے پانچواں حکم یہ ہے کہ

"اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو"۔ (الحجرات : ۱۰)

اس فرمان کی رُو سے یہ ضروری ہے کہ اگر دو مسلمان افراد یا جماعتوں یا قوموں کے درمیان تعلقات کی خرابی کی نوبت آجائے تو باقی مسلمان پوری کوشش کریں کہ ان کے باہمی اختلافات دُور ہو جائیں۔

باہمی انسانی تعلقات کی خرابی کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ جو فریق صراحتاً زیادتی کا روّیہ اختیار کیے ہوتا ہے، سمجھتا وہ بھی یہی ہے کہ میں برسرِ حق ہوں۔ اب اگر صلح کرانے والے اپنی ساری کوشش اسی پر مرکوز کر دیں کہ زیادتی کرنے والا اپنی زیادتی کو تسلیم کرے اور پھر اس زیادتی سے توبہ کر کے دوسرے کی طرف جھکے، تو اس سے معاملات بعض اوقات اور زیادہ الجھ جاتے ہیں۔ زیادتی کرنے والے کو مناسب طریقے سے اس بات کا احساس تو دلا ہی دینا چاہیے کہ اس نے زیادتی کی ہے۔ مگر زیادہ زور اس بات پر مرکوز ہونا چاہیے کہ دونوں کو عفو و درگذر کی فضیلت اور ثمرات یاد دلائے جائیں اور اس طرف توجہ دلائی جائے کہ اُن کی باہمی بے اتفاقی سے خود ان کی ذاتوں کو اور ملت کے وسیع تر مفاد کو کیا کیا نقصانات پہنچیں گے۔

اجتماعی زندگی میں رُوٹھے ہوؤں کو خود آگے بڑھ کر منا لینا اور دوسروں کے باہمی تعلقات کو درست کرانے کے لیے عملی کوشش کرنا ایسی چیز ہے جو معاشرے کے سُکھ چین کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ عوام تو کیا بڑے بڑے خواص کا بھی یہ حال ہے کہ وہ نظری حد تک تو اس بات کے ضرور قائل ہیں مگر اس سلسلے میں اُن کی عملی کوششیں تقریباً صفر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دعوتِ دین کے لیے اتنی زیادہ تنظیموں کے وجود میں آجانے اور ان تنظیموں کا

اپنا بہت سا وقت اور طاقتیں خود ایک دوسری کی مخالفت پہ صرف کرتے رہنے کی بہت سی ذمہ داری شاید خود اُن تنظیموں کے سربراہوں اور ذمّے دار کارکنوں ہی کے سر ہے۔ اُن میں سے غالب اکثریت کو شاید ہی کبھی خیال آتا ہو کہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ آخر ان کے درمیان ایسے کونسے بنیادی اختلافات ہیں کہ وہ مل کر چل نہیں سکتے۔ مل کر چل سکنا تو رہا ایک طرف، یہاں تو صرف آپس میں صلح صفائی رکھنا بھی محال ہو گیا ہے۔ ہمہ وقت گویا زبانِ طعن دراز رہتی ہے اور کسی کے دل میں اس بات کا خوف نہیں آتا کہ کل خدا کے حضور میں کہیں ہم مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے رہنے کے جرم میں ماخوذ نہ ہو جائیں۔ سبھی اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں کہ ہم خوب ہی کام کر رہے ہیں، ناخوب تو صرف دوسری طرف ہے۔

جب کسی ایک تنظیم کا سربراہ اپنی تحریر یا تقریر میں کسی دوسری تنظیم کے سربراہ پر کوئی بے بنیاد یا با بنیاد الزام لگاتا ہے تو دوسرا بھی اپنی تحریر یا تقریر میں اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے اور کوئی بھی اتنا خدا ترس اور دُور اندیش نہیں ہوتا کہ ایک صحیح مومن کی حیثیت سے خود جا کر اپنے معترض بھائی سے ملے اور آرام اور محبت سے پوچھے کہ بھائی، آخر آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے، مجھے بتائیے تاکہ میں انہیں رفع کرنے کی کوشش کروں۔ یہ نجی اور پُرخلوص ملاقاتیں شاید لمبی لمبی کاغذی جنگوں کی نوبت ہی نہ آنے دیں۔

امام غزالیؒ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "احیائے علوم الدین" میں اہلِ علم کے باہمی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"علماء نہایت سخت تعصب ظاہر کرتے ہیں اور اپنے مخالفین کو حقارت اور توہین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ مخالفوں کے مقابلے میں نرمی، ملائمت اور لطف سے کام لیتے اور تنہائی میں خیر خواہی کے طور پر سمجھاتے تو کامیاب ہوتے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"علماء نے تعصب کو اپنا آلہ بنالیا اور اس کا نام "حمایتِ مذہب" اور "مدافعتِ اسلام"

رکھا، حالانکہ درحقیقت یہ مخلوق کو تباہ کرنا ہے۔"

مخلوق تو تباہ ہوتی ہی ہے۔ جب مختلف گروہوں کے سربراہ ہی ایک دوسرے کی عزت ملحوظ نہ رکھیں گے اور ایک دوسرے سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرنا اپنے رُتبے سے گری ہوئی بات سمجھیں گے، تو پھر ان کے پیروؤں کو بھی تو انہیں کے طریقے سیکھنے ہیں۔ انہیں کیسے پتہ چلے کہ آگے بڑھ کر رُوٹھے ہوئے کو منا لینا کوئی فضیلت کی بات ہے۔ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے:

"کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو تین راتوں سے زیادہ چھوڑے رکھے۔ کہ دونوں باہم ملتے ہیں تو ایک اِس طرف منہ کر لیتا ہے اور دوسرا اُس طرف منہ کر لیتا ہے اور ان دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے"۔

(بخاری، مسلم۔ بروایت ابو ایوبؓ)

اب چونکہ ہمارے بہت سے دینی رہنماؤں کو یہ پورا یقین ہے کہ یہ حکم اُن کے لیے نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے اُن کے پیرو اور کارکن بھی اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ مطمئن ضمیر کے ساتھ ایک دوسرے کی مخالفت میں وقت، وسائل اور قوتوں کو قتل کرتے ہیں اور قطعی طور پر مواخذۂ آخرت کا خوف نہیں رکھتے ــــ ان "دینی رہنماؤں" اور ان کے کارکنوں نے آخر یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ ان کا کوئی فعل گناہ ہو ہی نہیں سکتا، چاہے وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی واضح حکم کی واضح نافرمانی ہی کیوں نہ ہو!۔

جب مسلمان خود ایک دوسرے کے آگے جُھکنے کو ذلّت سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر اپنی بے اتفاقی کے باعث اُن میں وہ ضعف آجاتا ہے کہ انجام کار وہ غیروں کے آگے جھک کر واقعتاً ذلیل ہوتے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ افراد کا باہم پُرخلوص ملاقاتیں کرنا، اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو تو اُسے رفع کرنے کی کوشش کرنا اور بڑھ کر روٹھوں کو منانا صرف انفرادی معاملات ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کا بسا اوقات اقوام کی تقدیروں پر اثر پڑتا

ہے ـــــ انسانی تاریخ میں مختلف اقوام کے درمیان جو ہولناک جنگیں لڑی گئی ہیں اور جو دُور رس فوائد رکھنے والے معاہدات ہوئے ہیں، ان کی وجوہ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ کئی خونریز جنگیں، جن میں ہزاروں لاکھوں کی جانیں گئیں اور وسیع علاقوں میں بربادی پھیلی، محض اس لیے لڑی گئیں کہ بعض چند افراد کو ایک دوسرے سے دشمنی تھی اور کئی معاہدات جنہوں نے مختلف اقوام کو بے پناہ فوائد پہنچائے، صرف اس لیے وجود میں آ گئے کہ بعض چند انسانوں کی آپس میں دوستی تھی۔

ہم خود اپنے اردگرد دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ دینی گروہوں کے بہت سے باہمی اختلافات اور بدمزگیاں محض اس لیے قائم ہیں کہ دینی رہنماؤں کا گروہ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی بدظنیاں رفع کرنے اور تعلقات استوار کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیونکہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ یہی سمجھے بیٹھا ہے کہ ایسا کرنا بے کار ہو گا، دوسرے کو ماننا تھوڑے ہی ہے!۔

اب اگر کوئی انسان کوشش کرنے سے پہلے ہی یہ سمجھ لے کہ اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونا تو پھر اس کا کیا علاج کیا جائے!۔

یہاں دعوتِ دین کا کام کرنے والوں سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ وہ اس بات کو شعوری طور پر ذہن میں تازہ رکھا کریں کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے رُوٹھوں کو بڑھ کر منانے اور دوسرے بہن بھائیوں کے باہمی تعلقات کو درست کروانے کی کوشش کرنے کے سلسلے میں جو جو حکم دیا ہے، اس کے مخاطب وہ خود بھی ہیں۔ یہ باتیں صرف لوگوں کو سنانے ہی کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ خود عمل کرنے کے لیے بھی ہوتی ہیں!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے" ـــــ آخر بہتر بننے کے موقع کو ہاتھ سے جانے کیوں دیا جائے۔ جو اس سلام کا جواب نہ دے گا، وہ خود نقصان میں رہے گا۔ اور ویسے تو مومن کے بارے میں حسنِ ظن

رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان یقین رکھے کہ وہ ان شاء اللہ اس سلام کا جواب ضرور دے گا!۔

ضروری تنقید

مندرجہ بالا پانچوں فرمان ایسے ہیں کہ اگر دعوتِ دین دینے والے اپنے دین کو نقصان سے بچانے کے واقعی متمنی ہیں تو انہیں ان فرمانوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا — اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ اپنا کوئی ساتھی واقعتاً شیطان کے پھندے میں پھنس کر غلط کاریوں کا ارتکاب کرنے لگا ہو اور بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہو کہ ہم اسے اس خرابی سے بچانے کی کوشش کریں۔ تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اسے بتانا تو پڑے گا ہی کہ تم اس غلطی کا ارتکاب کر رہے ہو، اسے چھوڑ دو، تو پھر اسے کس طرح بتایا جائے کہ وہ مشتعل ہو کر ضد میں بھی نہ آئے اور اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کا حق بھی ادا ہو جائے — اس معاملے میں بھی حضورؐ ہی کا ایک فرمان ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے:

"تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کا آئینہ ہے، پس اگر وہ اپنے بھائی میں کوئی خرابی دیکھے تو اُسے دُور کر دے۔" (ترمذی)

یہاں حضورؐ نے مومن کو جو آئینے سے تشبیہ دی ہے، اس کی وجوہ تشبیہ یوں بتائی گئی ہیں:

آئینہ بغض اور کینے کی خاطر نہیں بلکہ بے غرض، بے لاگ اپنا فرض سرانجام دیتا ہے۔ ایسے ہی داعی کی تنقید بھی کسی کینے یا غصّے پر مبنی نہیں ہونی چاہیے۔

آئینہ اتنے ہی داغ دکھاتا ہے جتنے فی الواقع موجود ہوں۔ چھپے داغ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ایسے ہی داعی کو بھی دوسروں کے عیبوں کی جستجو نہیں کرنی چاہیئے۔ ہاں جو نظر آ رہے ہوں اُن کی طرف مناسب انداز میں توجہ دلا دے۔

آئینہ اس انداز سے داغ بتاتا ہے کہ کسی کو اس کے اُوپر غصّہ نہیں آتا بلکہ

اپنے داغوں کو دُور کرنے کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ ایسے ہی داعی کو بھی محبت، ہمدردی اور شفقت سے تنقید کرنی چاہیے تاکہ وہ شخص اپنے عیب دُور کرنے کی طرف متوجہ ہو، مشتعل ہو کر اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کی مہم میں مصروف نہ ہو جائے۔

آئینہ اس وقت داغ بتاتا ہے جب اُس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا جائے۔ ایسے ہی داعی کی تنقید بھی اسی وقت مفید ہوتی ہے جب سننے والے کا ذہن اُسے سُننے کے لیے تیار ہو۔ ورنہ بات کو کسی بہتر وقت کے لیے اٹھا رکھنا چاہیئے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آئینہ خاموشی سے داغ بتا دیتا ہے۔ داغ والے انسان کو دنیا جہان میں رُسوا نہیں کرتا پھرتا۔ ایسے ہی داعی کو بھی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ غلطی کرنے والے شخص کو اس کے عیب چپکے سے اور رازداری سے بتائے اور معاشرے میں اس کی رسوائی کا باعث نہ بنے۔

ایک صاحبِ نظر شخص نے بڑی عمدگی سے تنقید کرنے کے اصول بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"تنقید کے معاملے میں چند احتیاطوں کو پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے، ورنہ تنقید اچھائی پیدا کرنے کے بجائے کسی بہت بڑے فتنے کا باعث بن جائے گی۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ تنقید ہر وقت اور ہر صحبت میں نہ کی جائے۔

دوسرے تنقید کرنے سے پہلے اچھی طرح غور کر لیا جائے کہ بات قابلِ تنقید ہے بھی کہ ایسے ہی زبان کھولی جانے لگی ہے۔

تیسرے تنقید کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو شاہد کر کے دل کا اچھی طرح جائزہ لے لیا جائے کہ جو تنقید ہم کرنے لگے ہیں۔ یہ واقعی حق کی خاطر ہے یا دل کے کسی دبے گھٹے کینے اور نفرت کے باعث۔

اگر تسلی ہو جائے کہ تنقید کسی نفسانی خواہش کی خاطر نہیں ہو رہی تو بھی تنقید کرتے ہوئے انتہائی محتاط اور نرم زبان استعمال کی جائے تاکہ مخاطب کو تسلّی رہے کہ آپ نے اس کی خیر خواہی کی خاطر زبان کھولی ہے۔ اُس کا دل دُکھانے کی خاطر نہیں کھولی اور

اگر غور کرنے پر ذرا بھی یہ محسوس ہو کہ اس وقت دعوتِ دین سے زیادہ دل کا بُغض نکالنا مقصود ہے تو فوراً استغفار کر کے رُک جانا چاہیے۔ اگر تنقید کے جواب میں دوسری طرف سے تنقید شروع ہو جائے اور پھر جواب الجواب کا سلسلہ چل پڑے تو کسی مناسب جگہ پر اس سلسلے کو ختم کر دینا ضروری ہے۔ ورنہ یہ ردّ و کد بن کر رہ جائے گی اور دعوت دین کا صرف نام ہی ہوگا۔"

جب معاملہ کسی اختلافی مسئلے کا ہو تو اس وقت تو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ زبان ایسی استعمال کی جائے جس سے دوسرے لوگ بھڑک نہ اٹھیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے مختلف فیہ مسائل ہزارہا کے مجمع میں ایسے عنوان سے بیان کیے کہ حق بھی ظاہر کر دیا اور مخالفین اور سامعین کو اعتراض کا موقع بھی نہیں دیا۔

ایسے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا فرمان ہے:

"نیک بات بتانا (گویا) زخم (لگانا) ہے۔ مگر نرمی اس کے لیے مرہم ہے"۔

غرضیکہ اللہ رب العالمین اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے یہ پانچ مندرجہ بالا فرمان ایسے ہیں، جن پر عمل کر کے انسان دعوتِ دین کو اُس بڑی آفت سے بچا سکتا ہے جو اس کے لیے زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتی ہے۔ مولانا محمد الیاسؒ نے اپنے ساتھیوں کو تبلیغ کے بارے میں جو ہدایات دیں اُن میں ایک یہ تھی کہ تبلیغ کرنے والا

"عام مسلمانوں کے ساتھ نہایت تواضع اور انکسار کا برتاؤ رکھے۔ بات کرنے میں نرم لہجہ اور تواضع کا پہلو اختیار کرے، کسی مسلمان کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ بالخصوص علمائے دین کی عزت اور عظمت میں کوتاہی نہ کرے۔ علمائے حق کی توہین دین کی توہین کے مترادف ہے جو خدا کے غیظ و غضب کا موجب ہے"۔

جو داعی ایک طرف تو دین کی دعوت دیں اور دوسری طرف اپنی بے اتفاقی اور حلم کی کمی کے باعث دین کو نقصان پہنچائیں۔ وہ بہت حد تک اس آیت کا مصداق بن جاتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"لَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا"۔

(نہ ہو جانا اُس عورت کی طرح جس نے آپ ہی محنت سے سُوت کاتا اور پھر آپ ہی اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

(النحل : ۹۲)

تعلق باللہ

ایک دن حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

"اے لوگو! میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اور اس کی ایسی تعریف کرو جس کا وہ سزاوار ہے۔ امید اور خوف دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر دعا مانگو۔ دیکھو خدا نے (حضرت) زکریاؑ اور اُن کے گھر والوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ لوگ نیکیوں کی طرف دوڑتے تھے۔ ہم کو اُمید و خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرتے تھے۔

اللہ کے بندو! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے حق میں تمہاری جانوں کو رہن رکھ لیا ہے اور تم سے عہد لیا ہے کہ دنیا کے عوض جنت کو مُول لوگے۔ اللہ کی کتاب تم میں موجود ہے جس کے اثرات کبھی ختم نہ ہوں گے اور جس کی روشنی کبھی گُل نہ ہوگی۔ اس لیے کلامِ الٰہی کی تصدیق کرو۔ اللہ کی کتاب سے نصیحت حاصل کرتے رہو، اور تاریکی والے دن کے لیے اس سے بینائی حاصل کرو۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کے لیے ہی پیدا کیا ہے اور تم پر کراماً کاتبین یعنی اعمال لکھنے والے فرشتوں کو مقرر کیا ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا علم اُن فرشتوں کو ہے۔

اللہ کے بندو! تم ہر صبح اور شام کو اس مدت سے قریب ہوتے جاتے ہو، جس کا تمہیں علم نہیں۔ اس لیے اگر ہو سکے تو اس حال میں تمہاری عمریں ختم ہوں کہ تم اللہ کے کام میں مشغول ہو۔ تم کو ایسا ہی کرنا چاہیے، مگر اللہ کی مدد کے بغیر تم ایسا نہیں کر سکتے، اس لیے اسی سے مدد مانگو۔"

اس کتاب کو لکھنے میں جو بنیادی مقاصد پیشِ نظر ہیں۔ یہ حکمت بھری تقریر نہایت

عمدگی سے اُن کا خلاصہ بیان کیے دے رہی ہے۔

یہ زندگی عارضی ہے۔ ہر گزرنے والا دن اور ہر آنے والی رات ہمیں ہمارے انجام سے قریب سے قریب تر لیے جارہی ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے، جب بھیجنے والے کے حضور ہیں دست بستہ کھڑے ہو کر اس بات کا جواب دینا ہوگا کہ جس مقصد کے لیے اس کرۂ ارض ہیں بھیجے گئے تھے، وہ پورا کیا یا نہیں۔ مگر اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اتنی عقل، اتنی سمجھ، اتنی دُور اندیشی، اتنی دُور بینی، اتنی فراست، اتنے صبرو استقلال اور اتنی پختگیٔ ایمان کی ضرورت ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی خصوصی امداد اور رہنمائی حاصل نہ ہو، اس کا پورا ہونا محال ہے۔ لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ عمل کی پوری کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے قلبی تعلق اور عبادت و دعا و التجا کا سلسلہ بھی مسلسل جاری رہے تاکہ مشکلیں آسان ہوتی رہیں، قدم ثابت رہیں، ڈھارس بندھی رہے، امید قائم رہے اور راہیں سُوجھتی چلی جائیں۔

جس دور ہیں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اس میں حق اور باطل، نیکی اور بدی، جائز اور ناجائز، صحیح اور غلط اس طرح آپس میں گڈ مڈ ہو کر رہ گئے ہیں کہ جب کوئی شخص حق اور نیکی اور جائز اور صحیح کو قائم کرنے کے لیے نکلتا ہے تو قدم قدم پہ اسے سوچنا پڑتا ہے کہ یہ جو اچھائی نظر آرہی ہے، اس میں بُرائی کا عنصر کتنا ہے۔ کہیں ایسے نہ ہو کہ اچھائی لیتے لیتے ساتھ بُرائی بھی آجائے اور یہ جو برائی نظر آرہی ہے اس ہیں اچھائی کا حصّہ کتنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بُرائی کا تدارک کرتے کرتے ساتھ ہی اچھائی بھی ہاتھ سے نکل جائے۔

اب کون ہے جو انسان کو وہ باریک بینی اور فراست عطا کرے جس سے کام لے کر وہ کامیابی کے ساتھ اچھائی پُوری کی پُوری لے لے اور بُرائی پوری کی پوری چھوڑ دے؟

پھر اچھے اوصاف، اسی وقت تک "اچھے اوصاف" ہوتے ہیں جب تک ان کے معاملے میں اعتدال پیشِ نظر رہے۔ اچھے سے اچھا وصف بھی راہِ اعتدال

سے ہٹ جائے تو بُرائی بن جاتا ہے۔

بدگمانی سے بچنا کتنا اچھا وصف ہے، مگر جب یہی شے اعتدال سے بہت آگے بڑھ جائے تو ایک نقص بن جاتی ہے۔ کسی داعی کے لیے یہ خوبی کی بات نہیں کہ وہ اپنے ساتھیوں کے معاملے میں اتنا زیادہ خوش گمان رہے کہ اُن میں سے کوئی علانیہ فسق و فجور میں بھی مبتلا ہو جائے تو بھی اُسے نہ اس کے نقائص نظر آئیں اور نہ وہ ان کی اصلاح کے لیے زبان ہلائے۔

ایسے ہی مسلمان سے محبت رکھنا نہایت ضروری شے ہے مگر اس محبت کو اس انتہا پر نہیں پہنچنا چاہیے کہ مسلمان اگر برسرِ ناحق بھی ہو تو بھی وہ سچا، اور غیر مسلم اگر سچا بھی ہو تو بھی وہ جھوٹا! — بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ انہیں اسلام کی سربلندی سے زیادہ مسلمانوں کا مادّی فائدہ عزیز ہو جاتا ہے۔ وہ صرف مسلمانوں کو مادّی فوائد پہنچانا چاہتے ہیں چاہے ایسا کرنے سے اسلام کے بنیادی اصولوں ہی کی مخالفت کیوں نہ ہوتی ہو۔

داعی کے لیے صبر و استقامت بھی نہایت ہی عمدہ اور ضروری وصف ہے۔ مگر اس میں بھی بعض لوگ اس قسم کا مبالغہ برتتے ہیں کہ خواہ مخواہ آزمائشوں کو دعوت دیتے ہیں، اور اپنے صبر و استقامت کو آزمانے کے لیے "آ بیل مجھے مار" والا رویّہ اختیار کر کے اپنی راہ میں بیکار دقّتیں کھڑی کر لیتے ہیں۔

اب کون ہے جو انسان کی انگلی پکڑ کر اسے چلائے اور اُسے ٹھیک ٹھیک اُس راہِ اعتدال پر قائم رکھے جس سے ہٹ جانے کے باعث اچھے اوصاف بھی برائیاں بن جاتے ہیں؟

بعض خاندانوں میں دیکھا گیا ہے کہ والدین بچّوں کو دین کی راہ پر قائم رکھنے کے لیے اتنی سخت گیرانہ اور متشدّدانہ پالیسی اختیار کرتے ہیں کہ ان کے بچے باغی ہو کر عام گھرانوں کے بچّوں سے بھی زیادہ بُرے ہو جاتے ہیں — اور بعض خاندانوں میں والدین یہ سمجھ کر کہ سختی بُرے نتائج پیدا کرے گی، نرمی کا رویّہ اختیار کرتے ہیں، مگر اس نرمی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بچّے بالکل مادر پدر آزاد ہو جاتے ہیں۔

اب کیسے پتہ چلے کہ نرمی اور سختی کے درمیان وہ ٹھیک معتدل راہ کونسی ہے جس پر چل کر ماں باپ بچوں کو صحیح مسلمان بھی بنا لیں۔ مگر نہ تو بچوں کی نگاہ میں ظالم ٹھہریں اور نہ بچے ہی مادر پدر آزاد ہوں؟

پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ انسان اپنے مخصوص میلانات، مزاج کی سختی یا نرمی یا بعض دوسرے مؤثرات کے باعث اپنے اعمال کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے۔ وہ سمجھ رہا ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، خوب کر رہا ہوں۔ مگر درحقیقت وہ ناخوب ہو۔

مثلاً عین ممکن ہے کہ جسے وہ "غیرتِ دینی" خیال کر رہا ہو، وہ محض فخر و غرور ہو، جسے وہ "حق گوئی" کہتا ہو وہ صرف لوگوں کو دشمن بنانے کے فن کی مہارت ہو، جسے وہ "دانائی" سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہو وہ صرف بزدلی اور فرار ہو، جسے وہ "اپنے اصولوں پر قائم رہنا" گردانے ہوئے ہو، وہ صرف قدامت پسندی ہو۔ اب کون اس کے دل و دماغ میں ان چیزوں کے باہمی نازک فرق کی پہچان پیدا کرے اور اسے اس قابل بنائے کہ وہ ناخوب کو خوب سمجھ کر نہ پکڑے رکھے؟

دینِ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی کا نام ہے اور یہ نظامِ زندگی قیامت تک کے لیے قابلِ عمل ہے اور قیامت آنے تک اَن گنت انکشافات و ایجادات انسان کی طرزِ زندگی پر اثر انداز ہوتی رہیں گی، جیسے کہ پچھلے چودہ سو سال میں بھی ہوتا رہا ہے۔ ہر آنے والا دن ایک نیا تغیر لاتا ہے اور انسانی زندگی اس سے لازماً متاثر ہوتی ہے۔ اسلام کے کچھ اصول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، جنہیں کسی صورت بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا، چاہے زمانہ کتنا ہی آگے کیوں نہ چلا جائے اور کتنی ہی پلٹنیاں کیوں نہ کھالے۔ پھر اسلام کی کچھ فروعی چیزیں ہیں جن کے لیے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے جانا ضروری ہے۔

مدتوں سے یہ صورتِ حالات چلی آرہی ہے کہ ایک گروہ ترقی کے جوش میں دین کے بنیادی اصولوں کو بھی بدل دینے پر تُل جاتا ہے اور اس طرح دین کا ڈھانچہ

ہی توڑ پھوڑ دیتا ہے ـــ اور دوسری طرف ایک جماعت دینی اقدار کو قائم رکھنے کی فکر میں ان فروعی چیزوں کو بھی بدلنے پر تیار نہیں ہوتی جنہیں لازماً بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے رہنا چاہیے اور اس طرح وہ ملت میں جمود پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔

اب کون ہے جو انسان کو وہ دُور بینی، وہ وسعتِ قلب اور وہ فہمِ دین عطا کرے جس سے کام لے کر وہ بنیاد ہی کو مضبوطی سے پکڑے رکھے اور فروعات کو فراخدلی اور وسیع النظری سے بدلتا چلا جائے ؟

عالمِ اسلام اس وقت بیسیوں ٹکڑوں میں بٹا ہوُا ہے اور معدودے چند کے سوا ہر جگہ وہی مادّی تہذیب قبلۂ مقصود بنی ہوئی ہے جو اپنی چمک دمک دکھا دکھا کر مسلمانوں کے اخلاق و ایمان کو برباد کرنے اور انہیں نسلوں، زبانوں، رنگوں اور وطنوں کے چکّروں میں پھنسا پھنسا کر ان کی اسلامی اخوّت کو پارہ پارہ کرنے پر تُلی ہوئی ہے اور وہ بھولے بھالے لوگ انسانیت کو جکڑنے والی ان زنجیروں کو زیور سمجھ سمجھ کر پہن رہے ہیں اور پھولے نہیں سما رہے ہیں !

کس میں یہ دم خم ہے کہ ان کروڑہا کروڑ "علاقائیت گزیدہ" لوگوں کو اس انتشار کی حالت سے نکال کر اسلام کی پکار پر ایک پلیٹ فارم پہ جمع کرے ؟ ملّت اسلامیہ صدیوں خوابِ خرگوش میں پڑی رہی اور حریفانِ اسلام ہوشیار و حیلہ جو، اس تمام دوران میں بیدار رہ کر اپنی علمی اور فنّی کاوشوں میں مصروف رہے ۔ اور اب صورتِ حالات یہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کا کوئی امیر سے امیر ملک ایک لوٹا ہوُا جہاز بھی نہیں بنا سکتا، وہاں دوسرے لوگ چاند تک جا پہنچے ہیں اور ایسے ایسے ہلاکت خیز آلات ایجاد کر چکے ہیں جن میں ایک ایک آلہ ایک ایک ملک کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔

اگر کامیابی صرف مادّی کوششوں ہی سے مل سکتی ہے تو پھر تو کوششیں شروع کرنے سے پہلے ہی ناامید ہو جانا پڑے گا کیونکہ علوم و فنون، ہوشیاری و چالاکی، تدبر و سیاست، انکشافات و ایجادات غرضیکہ سبھی معاملات میں مسلمان ان سے اتنا پیچھے رہ چکے ہیں کہ

گویا وہ ایک ننھا سا ممولا ہیں جو شہبازوں سے بھری ہوئی اُس فضا میں چاروں طرف سے گھرا ہوُا ہے۔

اب کون ہے جو شہبازوں میں گھرے ہوئے اس ممولے کو وہ آسمانی حفاظت اور وہ غیبی امداد عطا فرمائے، جس سے نہ صرف یہ کہ وہ زندہ رہ جائے، نہ صرف یہ کہ اُن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے بلکہ انہیں مات بھی دے سکے؟

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جبکہ ایک ایسی مادّی تہذیب دنیا پر چھائی ہوئی ہے، جو ہزارہا مقامات پر اسلام کی تہذیبی اقدار سے ٹکراتی ہے، خدا کے دین کو دنیا میں متعارف کرانا بلکہ خود مسلمانی کے دعوے داروں کو صحیح مسلمان بنانے کی کوشش کرنا اتنا مشکل اور پیچیدہ کام ہے کہ جو انسان یہ سمجھ لے کہ وہ صرف قوتِ عمل اور جدوجہد سے اس مہم کو سر کر لے گا، اُسے درحقیقت اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ اس مہم کی راہ میں کیا کچھ آتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ فرماتے ہیں:

"اپنے کسی کام پر بھروسہ نہ کرو، کیونکہ کامیابی کا دارومدار انسانی کوششوں پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لطف واحسان پر ہے"۔

جدوجہد اور عملی کوشش تو بے حد ضروری ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گہرا قلبی تعلق ہو، اور تسبیح وتہلیل، تلاوتِ قرآن پاک، نوافل اور روزوں اور دعا والتجا سے اس کی غیبی امداد طلب کی جاتی رہے۔ تاکہ وہ ہمیں وہ دُور بینی، وُہ باریک بینی، وُہ حکمت وفراست، وُہ فہم دین، وُہ صبر واستقامت اور وُہ غیبی امداد عطا فرماتا رہے، جس سے ہم اچھائی میں ملی ہوئی بُرائی اور بُرائی میں ملی ہوئی اچھائی کو تمیز کر سکیں اور سختی اور نرمی کے درمیان کی وہ معتدل راہ معلوم کر سکیں جو نوجوان طبقے کو دین کی طرف لانے میں ممدّ ہو۔ اور ہر اچھے وصف کے معاملے میں افراط اور تفریط سے بچ کر ٹھیک راہِ اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ اور اپنے نفس کی اس شرارت سے بچ سکیں کہ وہ ہمیں خوب کا جھکمہ دے کر ناخوب میں مبتلا کر دے۔ اور دین کے نہ بدلنے والے بنیادی اور بدل جانے والے فروعی امور میں

تمیز کر سکیں، اور اپنے آپ کو زبانوں، نسلوں، رنگوں اور وطنوں کی قیدوں سے آزاد کرا کے اسلام کے نام پر متحد ہو کر ایک عالمگیر ملّت کی شکل اختیار کر سکیں۔ اور رکاوٹوں کی ان چٹانوں کو توڑ سکیں جن کی حفاظت کے لیے ایٹم بموں کے پہرے لگے ہیں۔ اور دعوتِ دین کی راہ میں آنے والی تمام داخلی اور خارجی آزمائشوں، دقتوں، اذیتوں اور بے چینیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے راہِ حق پر ثابت قدم رہ سکیں۔

مختصر یہ کہ وہ ہماری انگلی پکڑے اور ہمیں اِدھر اُدھر بھٹک جانے، راہ میں کسی کھڈ میں گر جانے یا کسی دلدل میں پھنس جانے سے بچاتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف لیتا چلے۔

عملی کوشش اور امکان بھر جدوجہد کیے بغیر تو انسان اللہ تعالیٰ کے حضور میں سرخرو ہی نہیں ہوتا مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جس کام کے لیے عقل، سمجھ، دُور بینی، فہمِ دین، صبر و استقامت اور غیبی امداد کی اتنی ضرورت ہو جتنی کہ مندرجہ بالا حقائق سے ظاہر ہے، اسے سرانجام دیتے ہوئے صرف اپنی قوتِ عمل پر بھروسہ کر لینا طوفانوں کے مقابلے میں صرف تنکے پہ بھروسہ کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ دین کی راہ میں صرف عملی جدوجہد پہ بھروسہ کر لینا اور دعا و التجا سے بے نیاز ہو جانا ویسی ہی غلط بات ہے جیسی یہ کہ انسان صرف دعاؤں پر تکیہ لگا کر بیٹھ جائے اور نظامِ حیات کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے عملی جدوجہد بالکل نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ اس راہ کے مسافروں کو بار بار تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے اور اس سے مدد مانگنے میں سُستی نہ کریں۔ سورۃ المزّمّل کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسولِ خداؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

"اے کپڑوں میں لپٹنے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو، مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو،

ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لیے بہت مصروفیات ہیں، اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہٰذا اسی کو اپنا کارساز بنا لو، اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔ ان جھٹلانے والے خوش حال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

سورۃ الاحزاب، آیات ۴۱ تا ۴۴ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے حکم دیا ہے:

"اے ایمان لانے والو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔ وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے فرشتے تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لے آئے، وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے، جس روز وہ اس سے ملیں گے اُن کا استقبال سلام سے ہوگا اور اُن کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر فراہم کر رکھا ہے۔"

سورۃ قٓ، آیات ۳۹، ۴۰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"پس اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے رہو، طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت، پھر اس کی پاکی بیان کرو اور سجدے کرنے کے بعد بھی۔"

سورۃ الدہر، آیت ۲۵-۲۶ میں ارشاد ہوا ہے:

"(اے نبی)، اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اُس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔"

سورۃ الحجر، آیات ۹۷ تا ۹۹ میں حضورؐ کو ہدایت دی گئی ہے

"ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں، ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ پس (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس

کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ، اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔"

اس آیت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے کہ:

"تبلیغ حق اور دعوتِ اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگیٔ رب پر استقامت سے مل سکتی ہے۔ یہی چیز تمہیں تسلی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی اور تم کو اس قابل بھی بنا دے گی کہ دنیا بھر کی مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا ہے۔" (تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۱۹)

سورۃ الاعراف، آیات ۵۵، ۵۶ میں ارشاد ہوا ہے:

"(اے لوگو) اپنے رب کو پکارو، گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔"

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات کو، جس وقت کہ آخری تہائی رات باقی رہتی ہے، آسمانِ دنیا کی طرف اُترتا ہے اور فرماتا ہے کہ کون ہے جو مجھے پکارے تو میں اس کی پکار کو قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اُسے دوں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے تو میں اُسے بخش دوں۔" (بخاری)

مولانا محمد الیاسؒ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہماری اس دینی دعوت میں کام کرنے والے سب لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دینی چاہیے کہ تبلیغی جماعتوں کے نکلنے کا مقصد صرف دوسروں کو پہنچانا اور بتانا ہی نہیں ہے بلکہ اس ذریعے سے اپنی اصلاح اور تعلیم و تربیت بھی مقصود ہے۔ لہٰذا نکلنے کے زمانے میں علم اور

ذکر میں مشغولیت کا بہت زیادہ اہتمام کیا جائے۔ علم دین اور ذکر اللہ کے اہتمام کے بغیر نکلنا کچھ بھی نہیں ہے۔"

جناب حسن البناء شہید رح اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اللہ کی الوہیت ہر وقت آپ کے ذہن پر چھائی رہنی چاہیے۔ آخرت کو یاد رکھیئے اور اس کے لیے تیاری کیجیے، رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر سلوک کے مراحل ہمت اور استقلال سے طے کیجیئے، نفلی عبادات کے ذریعے خدا کا قرب حاصل کیجیئے، رات کے وقت نفل پڑھیے، ہر مہینے میں کم از کم تین دن کے روزے رکھیے، دل اور زبان سے اللہ کا ذکر کرتے رہیے اور منقولہ دعائیں ہر وقت نوکِ زبان رکھیے۔"

حضرت سلمان فارسی رض کا ارشاد ہے:

"دُکھ ہو یا سُکھ، ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو۔ جو شخص سُکھ میں اللہ تعالےٰ کو یاد کرتا ہے اور دُکھ کے وقت دعا کرتا ہے تو فرشتے اس کی آواز کو پہچان لیتے ہیں اور اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔"

حضرت عثمان رض کا فرمان ہے:

"اللہ تعالیٰ کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ترین ایمان ہے۔"

ابو عثمان نہدی تابعی فرمایا کرتے تھے:

"میں جانتا ہوں کہ خدا مجھے کس وقت یاد کرتا ہے۔"

کسی نے پوچھا۔ "کیسے۔"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا، اس لیے جب میں اسے یاد کرتا ہوں تو وہ مجھے یاد کرتا ہے اور جب ہم اس سے دعا کرتے ہیں تو اس کی قسم کہ وہ قبول کرتا ہے، پھر فرماتا ہے کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے متعلق روایات آتی ہیں کہ آپ نے عبادت گزاری کے لیے گھر میں ایک حجرہ مخصوص کر لیا تھا، جس میں کمبل کے سلے ہوئے کپڑے رکھے رہتے

تھے۔ جب رات کا پچھلا پہر ہوتا تو دن کے کپڑے اتار ڈالتے اور ان کپڑوں کو پہن کر مناجات اور گریہ و بکا میں مصروف ہو جاتے۔ مشہور تالیف "طبقات ابن سعد" میں بیان ہوا ہے کہ آپ ہمیشہ دوشنبہ اور جمعرات کو روزہ رکھتے۔

واضح رہے کہ یہ اُسی معروف شخص کی عبادت گزاری کا حال ہے، جس کی سلطنت تین برّاعظموں میں پھیلی ہوئی تھی اور جو ہمہ وقت اشاعتِ دین کی فکر میں رہتے تھے۔ اگر انہیں اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے عبادت اور دعا و التجا کے لیے وقت مل جاتا تھا تو پھر عام انسانوں کو کیوں نہیں مل سکتا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"جس نے میرے دوست سے دشمنی کی تو اس کو میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے، اور اگر میرا بندہ فرض کی ادائیگی کے ذریعے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے۔ تو مجھے اس سے زیادہ محبوب اور کوئی ذریعہ نہیں، اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب چاہتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں اسے محبوب بنا لیتا ہوں تو

میں اس کی شنوائی بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے،

اور اس کی بینائی بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے،

اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے،

اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے،

اور اگر وہ مجھ سے (کچھ) مانگتا ہے تو اسے ضرور دیتا ہوں،

اور اگر وہ کسی سے پناہ چاہے تو اُسے پناہ بھی ضرور دیتا ہوں"۔ (بخاری)

دعوتِ دین کی راہ میں آنے والی مشکلات اور پیچیدگیوں میں گھرے ہوئے ایک انسان کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی اور نصرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شنوائی بن جائے اور اس کی بینائی بن جائے اور اس کا ہاتھ بن جائے اور جو

کچھ وہ مانگے اسے عطا کرے اور جب وہ اس کی پناہ چاہے تو وہ اسے اپنی پناہ میں لے لے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے ایک دفعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا:
"امیرالمومنین! اگر آپ کا توکل اللہ پر ہو تو کسی کا خوف نہ کھائیے اور اگر خدا سے تعلق کمزور ہو تو سمجھ جائیے کہ پھر کوئی سہارا نہیں۔"

ہم نے اس عہد میں آنکھیں کھولی ہیں جب ملّتِ اسلامیہ اپنی صدیوں کی نیند کو جھٹک کر اپنے چھنے ہوئے مقام کو واپس لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے.... یہ صرف اللہ عالم الغیب ہی کو معلوم ہے کہ اس کے اپنے مقام کو حاصل کرنے سے پہلے کتنی نسلوں کو خون پسینہ ایک کرنا ہوگا۔

خوش بخت ہے ہر وہ انسان جسے یہ سعادت نصیب ہو جائے کہ وہ اس مقدّس تگ و دو کا ایک ادنیٰ حصّہ بن سکے۔

بارالٰہا، رات بڑی تاریک ہے، منزل بہت دُور ہے اور راہ میں بلاؤں کا ہجوم ہے! مگر تیرے عاجز بندے تیرا پاک ذکر کرتے ہوئے اپنی عاجزانہ کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس اُمید میں، اس توقع میں کہ ایک نہ ایک دن تو اُنہیں ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا ہی دے گا۔

یہ ہجر کی شب جو تیرہ تر ہے، دراز تر ہے، محیط تر ہے
کہانیاں تیری کہتے کہتے یہ رات بھی ہم گزار لیں گے